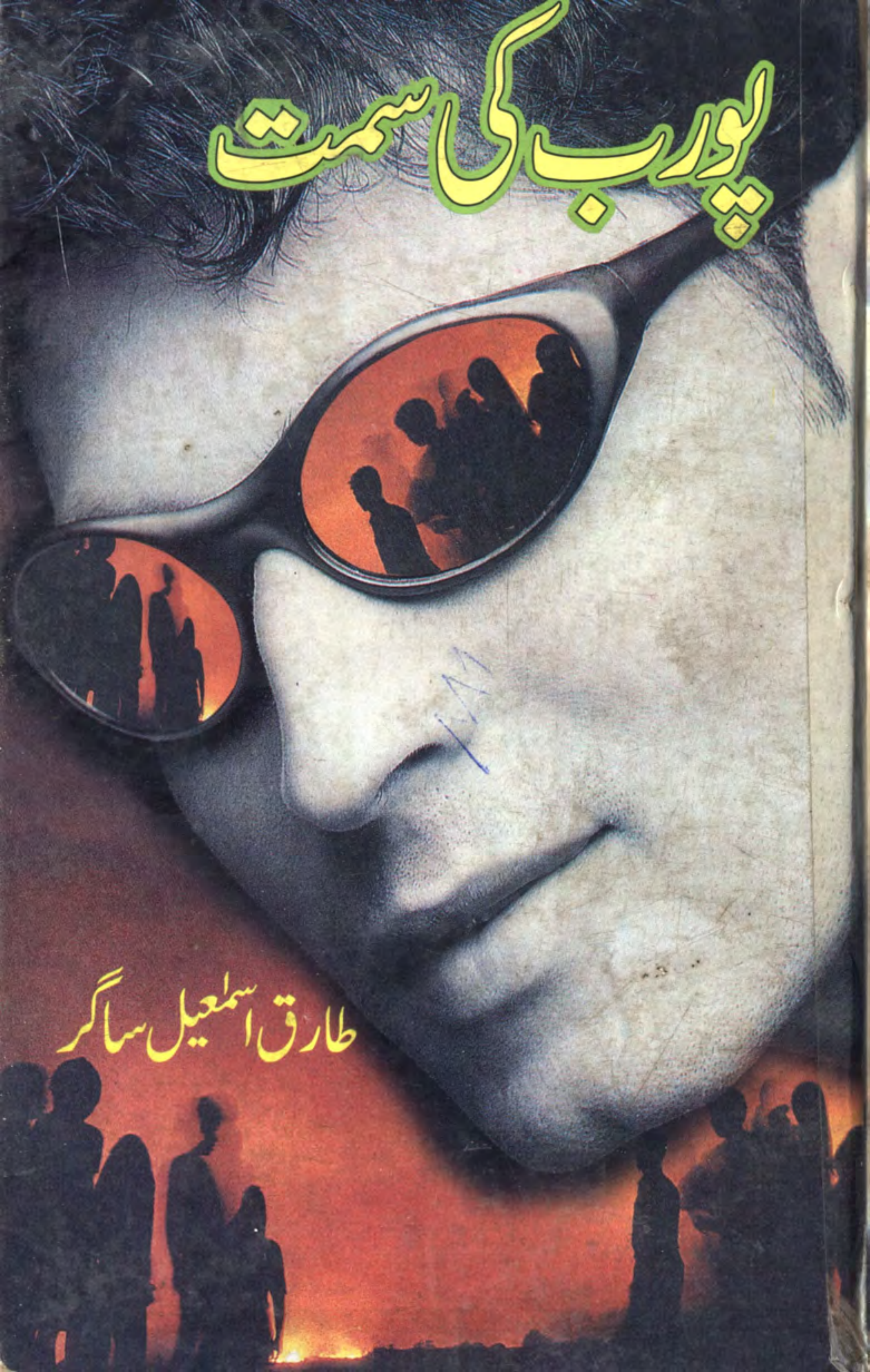
پورب کی سمت
طارق اسمٰعیل ساگر

"پورب کی سمت" میری ان کہانیوں کا مجموعہ ہے جو میں نے 80ء اور 90ء کے درمیان لکھی تھیں۔ ان میں کچھ افسانے بھی شامل ہیں۔ یہ بھی میرا حسن ظن ہے۔ معلوم نہیں نقاد حضرات جو عموماً مجھ سے ناراض رہتے ہیں انہیں افسانہ تسلیم بھی کرتے ہیں یا نہیں۔

میرے قارئین جانتے ہیں میں نے جو کچھ بھی لکھا جتنا کچھ بھی لکھا۔ وہ اپنے اور اپنے پڑھنے والوں کے لئے لکھا۔ ناقدین کے لئے نہیں۔ میں نے زندگی کبھی بیساکھیوں کے سہارے بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کیا۔ اس لئے مجھے نقاد کی ادبی بیساکھیوں کی ضرورت بھی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔

میں ادب کا لبادہ اوڑھنے والے ہر اس "مافیا" پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہوں جس نے اس مملکت خداداد میں کہ جہاں خواندگی کا تناسب پہلے ہی بمشکل تیس فی صد ہے ایک سازش کے تحت پڑھے لکھے لوگوں کا رابطہ کتاب سے جڑنے نہیں دیا کیونکہ وہ اجارہ دار بن کر یہاں بھی اپنی دکانداریاں چمکانے کے فکر میں کوشاں ہیں۔

ان لوگوں کی منافقت کی انتہا یہ ہے کہ ایک دوسرے کا وجود صرف اس لئے قبول کر رہے ہیں کہ ایک دوسرے کی بیساکھی بنا ہوا ہے۔

ذہنی بانجھ پن کا یہ عالم ہے کہ جو بے چارہ ادیب ان کے آستانوں تک رسائی حاصل نہ کرے اسے سرے سے ادیب ہی نہیں مانتے۔

جو ان کی چوکھٹ پر سجدہ ریز نہ ہو ان کے اعزاز میں محفلیں نہ سجا سکے یا ان محافل میں اپنا حصہ بخرہ نہ ڈالے اسے اپنا خیالی دشمن تصور کر کے اس کے خلاف ہرزہ سرائی میں مصروف رہتے ہیں۔

دراصل یہ وہ روحانی کوڑھی ہیں جو اپنی محرومیوں کا بدلہ معاشرے سے چکانے پر تل گئے ہیں۔ جو ساون کے اندھے کی طرح صرف اپنی ذات کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں۔ وقت بہت بڑا منصف ہے۔

کوئی دم جاتا ہے کہ ان کی اصلیت بے نقاب ہو گی، ادب میں تازہ ہوا کے جھونکے اس عذاب کی بشارت ہیں جو ان منحوسوں پر اترنے والا ہے۔

عنقریب یہ ادبی مافیا اپنے انجام کو پہنچے گا کہ جھوٹ کی عمر طویل سہی لیکن تا بہ کہ؟

طارق اسمٰعیل ساگر، لاہور

پورب کی سمت

"سنو!"

"جی فرمائیے۔" کہنیاں میز پر ٹکا کر ہاتھوں کے کٹورے میں اپنے چاند چہرے کو جمائے اس نے حیرت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ایک تھا بے چارہ مسافر۔ دھندے کی تلاش میں نکلا تھا، گھر کا راستہ اسے ایک چوراہے پر لے آیا۔ جس کے ایک کونے میں فقیر دھونی رمائے بیٹھا تھا۔

"بابا قسمت آزمانے نکلا ہوں کون سی سمت اختیار کروں؟" مسافر نے اس خدا مست درویش سے رہنمائی چاہی۔

"بچہ تین سمتیں اختیار کرنا۔ پورب کی سمت ہرگز نہ جانا۔ بڑی خطرناک راہ ہے وہ قدم قدم پر آسیب جال پھیلائے بیٹھے ہیں اور ہاں سنو! سنو اس راستے میں کالی چڑیل کا مسکن ہے جس نے بڑی خوبصورت شہزادی کو قید کر رکھا ہے۔ جو بھی اس طرف گیا پتھر کا بن کر رہ گیا۔"

وہ جو مسافر تھا نا! مہم جو طبیعت تھی اس کی اور مظلوم شہزادی کے ذکر سے تو اس کا دل بھر آیا۔ درویش سے بولا۔

"بابا میں تو اب پورب ہی کی سمت جاؤں گا۔"

درویش نے بہتیرا سمجھایا، ڈرایا، دھمکایا لیکن وہاں تو عزم راسخ تھا۔ مسافر اپنی بات پر اڑا رہا تب فقیر نے ترس کھا کر اسے سلیمانی ٹوپی اور جادو کا ڈنڈا دے دیا۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ ان کی کرامت کا تماشہ صرف ایک ہی مرتبہ کر سکے گا۔ مسافر کو جلد ہی ایک اونچے سنہری مینار میں مقید، مقہور شہزادی دکھائی پڑی جس کی درد بھری التجا سے رلا گئی اور جان جوکھوں میں ڈال کر اس نے سلیمانی ٹوپی اور جادو کے ڈنڈے کی مدد سے شہزادی کو ظالم چڑیل کے چنگل سے رہائی دلا دی۔ اس کوشش میں بے چارے نے سلیمانی ٹوپی اور جادو کے ڈنڈے سے بھی ہاتھ دھو لئے کہ فقیر نے انہیں صرف ایک مرتبہ استعمال کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"اچھا جی" ساحرہ کی شرارتی آنکھوں نے انگڑائی لی۔

"جانتی ہو شہزادی نے اسے کیا انعام دیا؟" میں نے چائے کا کپ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"جناب کہانی بنانا آپ کا پیشہ ہے میرا نہیں۔ میں بے چاری تو سن رہی ہوں۔ ہاں انجام بھی بتا دیجئے نا!" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے چپک گئی۔

"وہ جو شہزادی تھی نا، وہ اصل میں کوہ قاف کی پری تھی۔ رہائی پا کر اس نے مسافر کا شکریہ ادا کیا اور اسے اکیلا چھوڑ کر اپنے دیس پرواز کر گئی۔

"چہ چہ چہ لیکن پریاں تو بڑی رحمدل ہوتی ہیں۔" ساحرہ نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اب کیا کیا جائے کہ ظالم پریاں بھی ہوتی ہیں۔" میں نے چائے کا لمبا گھونٹ حلق میں انڈیلا۔

"ایک بات بتائیے؟"

"پوچھو۔"

"یہ سارے شاعر ادیب ایک سی باتیں ہی کیوں کرتے ہیں؟ بڑی الجھی الجھی سی گفتگو ہوتی ہے آپ سب کی۔ کم از کم میرا تو یہی خیال ہے۔"

"اچھا! اس سے پہلے بھی ایسی باتیں سن رکھی ہیں تم نے؟" اس لمحے مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔ ساحرہ کی بات نے ایک درد سا میرے لہجے میں گھول دیا۔ چائے کا ذائقہ ترش ہونے لگا۔

میری اس تبدیلی کو اس نے فوراً محسوس کر لیا اور ہنستے ہوئے بات کا رخ بدل دیا۔

ساحرہ سے یہ میری پہلی ملاقات اس حوالے سے تو ضرور تھی کہ ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔ لیکن ہم میں اجنبیت بھی ایسی کوئی باقی نہیں رہی تھی۔ پچھلے دو سال سے ہمارا خطوط کے ذریعے ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ وہ میری تحریروں کی بڑی مداح تھی۔ خود مجھے بھی اپنی لکھی وہ کہانیاں یاد نہیں رہی تھیں جن کے حوالے وہ اپنے خطوط میں دیا کرتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ مرحلہ بھی آ گیا جب مجھے اس کے خط کا شدت سے انتظار رہنے لگا۔ ساحرہ سے مجھے اب قلبی لگاؤ ہو گیا تھا اور دن رات اس سے ملاقات کے سپنے دیکھتا رہتا۔ خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ ہی گیا۔

بمشکل دفتر سے ہفتے کی چھٹیاں لے کر میں کراچی آیا تھا۔ اس کے حالات جہاں تک میں جان پایا اس کی امارت کے غماز تھے۔ میں نے دانستہ اسے آمد کی اطلاع کراچی پہنچنے کے بعد کی اصل میں میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبے سے برآمد ہوتے دیکھ لے۔ ہوٹل سے جب میں نے اسے ٹیلی فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی تو حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات سے اس نے مجھے خوش آمدید کہا۔

کراچی پہلی مرتبہ آیا تھا اور راستوں سے قطعاً اجنبی، اس نے مجھے رکنے کو کہا اور تھوڑی ہی دیر بعد جب دروازہ کھلا تو میرے سامنے "ساحرہ" کھڑی تھی۔ وہ الف لیلوی کہانیوں کی خوبصورت جادوگرنیاں جو راہ بھٹکے مسافروں کو اپنے حسین دامِ الفت میں

پھنسا کر آدمی سے پتھر کا بت بنا دیا کرتی تھیں۔ ساحرہ جتنی خوبصورت ہرگز نہیں ہوں گی۔ کراچی کی جاں سوز گرمی میں اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پہاڑی کے دامن میں کوئی جھرنے کے نیچے بیٹھا غسلِ صحت فرما رہا ہو۔

وہ میرے تصورات سے زیادہ حسین تھی۔ جب میں اس کی سحر زادہ معیت میں ہوٹل کی سیڑھیاں اتر رہا تھا تو کرسمس کے کارڈوں پر بنی ننھے فرشتوں کی تصویریں میرے ذہن میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ وہ اپنی گاڑی میں مجھے لینے آئی تھی۔ میری شخصیت اس کے سامنے دب کر رہ گئی۔ اس لمحے مجھے افسوس بھی ہوا۔ اس سے ملنے پر۔ میں نے سوچا اگر ساحرہ سے نہ ملتا تو زیادہ بہتر تھا اب تو بھرم ٹوٹتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن یہ پہلی ملاقات تک ہی محدود رہا جلد ہی ہم فری ہو گئے۔ میری لفاظی نے کسی حد تک مجھے سہارا دیا۔ ساحرہ مجھے رات کافی دیر تک شہر نگاراں کی سیر کرواتی رہتی۔ اس دوران میں اس نے میرا تعارف اپنے والدین سے بھی کروا دیا۔ بڑے نفیس لوگ تھے وہ مجھے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اور اس بات پر ناراضی کا اظہار بھی کیا کہ میں ہوٹل میں کیوں قیام پذیر ہوں۔

میرے جی میں کئی مرتبہ آئی کہ اس پر اپنا حالِ دل بیان کر دوں۔ لیکن یہ رعب حسن تھا یا میری بزدلی کہ میں اسے بین السطور بھی ڈر کے مارے کچھ نہ کہہ سکا۔ کل مجھے واپس چلے جانا تھا اور آج میں بڑے پختہ عزم سے اس کے سامنے بیٹھا تھا کہ اس پر اظہارِ محبت کر کے رہوں گا۔

ہم لوگ ایک خوبصورت ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ نیم تاریک ماحول اور ساحرہ کی محبت نے مجھے زیادہ ہی جذباتی کر دیا اس لمحے جب میں حالات سازگار پا کر اس سے مدعا بیان کرنے والا تھا۔ اچانک ساحرہ کی خوبصورت آنکھوں کا زاویہ بدل گیا اس کی نظروں کا تعاقب مجھے ہال میں داخل ہوتے اس وجیہہ و شکیل نوجوان تک لے گیا جو بڑے وقار

سے ہماری طرف آرہا تھا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ آپ کا تعارف آج ایک دلچسپ شخصیت سے کراؤں گی۔" ساحرہ کے شوخ لہجے نے میری سماعت کو جھنجھوڑا۔

"ہوں۔" میرے منہ سے بمشکل نکلا۔ وہ اسمارٹ نوجوان اب ہمارے بالکل قریب کھڑا تھا۔

"ہیلو ساحرہ!"

ہیلو عامر۔ ان سے ملو یہ ہیں میرے فیورٹ رائٹر مسٹر شاہد عزیز۔"

"بڑی خوشی ہوئی جناب آپ سے مل کر ساحرہ تو آپ کی تحریروں کی دیوانی ہے۔" اس نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔

میں نے اپنا ہاتھ ہپناٹزم کے کسی "معمول" کی طرح اس کی طرف بڑھایا۔ ہال کے مختلف کونوں میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف جوڑوں کے قہقہے میری سماعت میں دھماکے پیدا کرنے لگے اور سگریٹوں کا دھواں مرغولے بن کر میرے حلق میں اترنے لگا۔ ایک پھانس سی گلے میں اٹک گئی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری قوت گویائی کو موت آگئی ہو۔ مجھے کسی نادیدہ ہستی نے اٹھا کر کھڑا کیا اور پھر بٹھا دیا۔ عامر ساحرہ کا منگیتر تھا اور قریباً پندرہ بیس منٹ ہمارے درمیان موجود رہا۔ وہ بڑی مشکل سے میرے "اعزاز" میں اتنا وقت نکال سکا تھا ورنہ بزنس مین کے پاس اتنا فالتو وقت کہاں ہوتا ہے وہ تو وہاں ہرگز نہ آتا لیکن منگیتر کی خواہش نہ ٹھکرا سکا۔ میرے موڈ کی اچانک تبدیلی کو شاید اس نے محسوس ہی نہیں کیا یا پھر اس کی پروا نہ کی۔ اس کے جاتے ہی میں نے بھی ساحرہ سے اٹھ جانے کی درخواست کی اور ایک ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اس نے مجھے روکنا چاہا لیکن اب رکنے والی بات ہی کیا رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہے جناب۔ ادیب تو موڈ کا مالک ہوتا ہے ہم ٹھہرے بیچارے عام سے

بندے کیا سمجھ پائیں گے۔" اور میں صرف مسکرا کر رہ گیا۔

اکثر جس جگہ ساحرہ مجھے لیجایا کرتی تھی، میں معلومات میں اضافے کے لئے اس جگہ کا نام ضرور پوچھ لیا کرتا تھا۔ لیکن کچھ اتفاق جانیے کہ اس روز میں نے ساحرہ سے اس جگہ کا نام دریافت نہ کیا۔ وہ رات میں نے کانٹوں کی سیج پر کاٹی۔ زندگی نے کتنا بھیانک مذاق کیا تھا مجھ سے، اس کا احساس کچھ میں ہی کر سکتا تھا۔

اگلے روز جب ساحرہ مجھے الوداع کہنے آئی تو میری ذہنی ہی نہیں جسمانی حالت بھی بڑی ابتر دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے جناب بڑے سوگوار نظر آرہے ہیں کہیں کوئی محبت وغیرہ کا چکر تو نہیں چل گیا؟" اس کے لہجے کی شوخی حسب معمول برقرار تھی۔

ہم دونوں ان سیڑھیوں کے نزدیک پہنچ چکے تھے جنہیں عبور کر کے مجھے دوسری طرف کھڑی ٹرین تک جانا تھا۔ میں اچانک رک گیا۔ دل بھر آیا تھا اس کی بات کا اور تو کوئی جواب نہ سوجھا۔ میں نے اتمام حجت کو یونہی پوچھ لیا۔

"ساحرہ۔ جس جگہ ہم گئے تھے اس کا نام کیا تھا۔"

"چورنگی۔" اس نے جواب دیا۔

"چورنگی شاید اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے چار راستے پھوٹتے ہیں۔" میں کسی سحر زدہ معمول کی طرح گہرے کنویں سے اسے خطاب کر رہا تھا۔

"کیوں؟" حیرت زدہ آنکھوں کی جوت جاگی۔

"سنو! میں نے غلطی سے پورب کی سمت اختیار کر لی تھی۔" میری آنکھیں بے اختیار چھلکیں اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے قریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں عبور کی تھیں۔ سیڑھیوں کے ایک کونے میں سانس لینے کو رکتے ہوئے مسافر نے دھندلائی آنکھوں سے نیچے نظر دوڑائی۔ کوہ قاف کی شہزادی حیرت سے اس کا نظارہ کر رہی تھی۔

خانگی

سرداراں ایسی طوائف بھی پورے بازار میں ایک تھی۔ سانولی نکل گئی تو کیا ہوا؟

"اے بی وہ تھی کن کی، کن میں سے تھی۔ ہائے رے وہ گھڑی جب اماں نے بغیر قوم پوچھے رسم ادا کروا دی۔"

ایک روز جب نچلے بازار والی پٹھانی نے کہہ دیا۔ "بہن بڑھاپے کا سہارا تو تھا اب ڈھلتی عمر ہے۔ گڈو کی تعلیم جانے کب مکمل ہو تو تم کوئی سکھ کی گھڑیاں دیکھو گی۔"

تو!--- سرداراں اسے مارنے کو اٹھی تھی۔ وہ تو بھلا ہو مائی جیونی کا جس نے بیچ بچا کروادیا۔ ورنہ تو بازار میں وہ ڈگڈگی بجتی کہ ایک عالم تماشہ کرتا۔

"سانولی نکل گئی تو کیا ہوا؟ مولا عباس رکھے میری گڈی کو۔ لونڈیا کے پیر دیکھے ہیں۔ استاد نے اور میری بیٹی کا گلا پٹیالے والے خان صاحب سے تعلیم دلوا رہی ہوں۔ دیکھنا پورے بازار کی ناک ہو گی میری بیٹی۔" سرداراں نے بھری مجلس میں پٹھانی کے وہ لتے لئے کہ سب چپ چاپ دیکھا کئے۔

"رسی جل گئی پر بل نہ گئے۔" اس کے اٹھتے ہی پٹھانی نے دل کی بھڑاس نکال دی۔

سانولی نے کوئی معمولی دھچکا نہیں لگایا تھا۔ سرداراں کو۔ اس کی ساری زندگی کی کمائی یہی دو بیٹیاں ہی تو تھیں۔ پہلے روز جب سانولی مجرے پر بیٹھی تو سارے بازار نے

دیکھا۔ سرداراں نے کیا نہیں کیا تھا؟ کون سی کمی رہنے دی تھی اس نے؟ تین روز تک گھر کی روٹی تمام استادوں پر حرام تھی۔ انہیں پر کیا موقوف ارد گرد کے تمام بھیک منگے وہیں چلے آئے تھے۔ پھر شاید اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر کھا گئی۔ ابھی دو مہینے ہی گزرے تھے کہ لونڈیا کہ دھوم مچ گئی۔ سارے شہر کے شرفاء امڈے چلے آتے تھے جس روز وہ موا کباڑیا آیا اس روز سرداراں کا ماتھا تو ضرور ٹھنکا۔ آخر کو وہ خاندانی طوائف تھی۔ تماشبین کی نظر کی پہچان اس سے زیادہ اور کسے ہو گی؟ لیکن چپکی ہو رہی۔ آسامی مالدار تھی۔ پھر سرداراں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ یہی تو سبق اسے پڑھایا جارہا تھا پچھلی تین نسلوں سے۔

"چودھری یہ بوتل لے کر یہاں نہ آیا کرو۔ اس کوٹھے پر شرفاء آتے ہیں۔ ایسا شوق پورا کرنے کو باقی بازار مر تو نہیں گیا۔" بالآخر اس نے ایک روز بلے کباڑیئے سے کہہ ہی دیا۔

"بائی کیوں ٹھٹہ کرتی ہو۔ ہم نے تو اپنے اندر کی آگ میں جلنے آتے ہیں۔ تمہارا کیا لیتے ہیں اور یہ تم جانتی ہی ہو کہ سارے شرفاء ایک طرف اور بلا ایک طرف۔ جب جی چاہے آزمالینا۔" اس نے سو سو کے پانچ نوٹ سرداراں کی طرف اچھال دیئے۔

"اے نہیں میاں!"--- سرداراں نے نوٹوں پر جھپٹتے ہوئے کہا۔ "میں تو یونہی کہہ رہی تھی تم جانو تحصیل دار ہے نا۔ اس نے بڑا غصہ کیا تھا۔" سرداراں نے کمال مکاری سے بلے کباڑیئے کی بلائیں لیتے ہوئے رقابت کا موثر ہتھیار آزمایا۔

"دیکھ لیں گے اسے بھی۔" بلے نے--- سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔

اس کے بعد وہ کبھی بوتل لے کر نہ آیا۔ یہ ضرور تھا کہ اس کی آمدن کے اوقات میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ سانولی بھی سرداراں کی بیٹی تھی۔ کیا مجال جو ماں پر کبھی کچھ ظاہر ہونے دیا ہو۔ صاحبزادی کے لچھن تب کھلے جب ایک روز غائب ہو گئی۔

جاتے ہوئے وہ سوائے تن کے کپڑوں کے اور کچھ نہ لے گئی تھی وہ بھی ایک روز سرداراں کو وصول ہو گئے۔ اس اطلاع کے ساتھ کہ سانولی اور بلے نے عدالت میں نکاح کر لیا ہے اور اب سانولی اپنی پچھلی گھناؤنی زندگی کو بالکل بھول جانا چاہتی ہے۔

کیا کیا دکھ نہ اٹھائے تھے اس نے اپنی اولاد کے لئے ایک دفعہ جب سانولی کو یرقان ہوا تو سرداراں نے چاندی کا پنجہ اور علم چڑھایا تھا۔ مولا عباس کی نیازیں اس سے سوا تھیں۔

"ہائے بیٹی تو اسی روز کیوں نہ مر گئی، تب مجھے حوصلہ تو رہتا۔" اس نے صرف ایک ہی بات کہی اور چپ سادھ لی۔

ماکھے کو بلا کر اس نے بات سمجھائی تو ماکھے نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہ مائی مولا حسین کی قسم میرے جیسے تو اس کے ڈیرے پر پانی بھرتے ہیں۔ تم بس اس کو تقدیر جان کر قبول کر ہی لو تو بہتر ہے۔" جب بازار کے بڑے بدمعاش نے یہ بات کہہ دی تو سرداراں بھنا کر رہ گئی۔ لیکن اس نے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ اپنی سی کر گزری تھی وہ تو برا ہو ستاروں کا کہ الٹے ہی پھرے۔

سرداراں نے اس انتظار میں کہ عشق کا نشہ اترتے ہی سانولی واپس آ جائے گی، دو ماہ تک اس کا انتظار کیا لیکن اسے نہ آنا تھا نہ آئی۔ پھر تو جیسے سرداراں کو صبر آ گیا۔ اس نے حالات سے مفاہمت کر لی اور سب کچھ بھلا کر گڈو کی تربیت میں جت گئی۔

گڈو کے سارے اللے تللے پورے ہو رہے تھے۔ کیا مجال جو کسی چیز میں فرق آنے دیا ہو۔ سرداراں نے ایک سے ایک بڑھ کر استاد، ناچ کا بھی، گانے کا بھی رکھا تھا۔ شریکے برادری کا معاملہ تھا۔ کبھی کسی "ختم" سے ناغہ نہ کرتی۔ مبادا بازار والیوں کو کچھ کہنے سننے کا موقع مل جائے۔ ہر جمعرات کو حضرت شیر شاہ کے ہاں حاضری ہوتی۔ چڑھتے چاند کی پہلی جمعرات کو مائی عیداں کے امام باڑے میں مجلس علیحدہ جمتی۔ ایک سے ایک بڑھ کر ذاکر بلواتی تھی سرداراں۔

بابا مہنگا جو اپنے مربعے اس کے عشق میں پھونک کر کنگلا ہو گیا تھا پھر اسی چوکھٹ کا ہو رہا۔ سرداراں احسان فراموش ہوتی تو دانے ختم ہوتے ہی جوتے مار کر بھگا دیتی۔ لیکن تھی رحم دل۔ ذرا کہیں پیاسوں کا بیان سنا پچھاڑیں کھا کر گرتی۔ آنسوؤں کے تو جیسے جھرنے بہنے لگتے تھے اس کی آنکھوں سے۔

"اللہ بخشے اماں بتاتی تھی میں بٹالے والے سیدوں میں سے ہوں۔" وہ بڑے فخر سے کہا کرتی۔

دوسرے تیسرے روز بابا مہنگا کو بھی آدھ تولہ افیم ملتی ہی رہتی تھی۔ ڈیرے کی چائے کا بل علیحدہ اٹھ رہا تھا۔ خدا جانے کون سے خزانے دبا رکھے تھے سرداراں نے۔ کہاں سے یہ سارا دھندہ چل رہا تھا ورنہ تو وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہی تھی۔

"خانگی ہے۔" ایک روز شیدو نے کہیں کہہ دیا۔

پھر کیا تھا۔ وہ حشر کیا تھا سرداراں نے اس کا کہ بے چاری کئی روز تک تو کوٹھے سے نیچے نہ اتری، بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا تھا اسے بھرے بازار میں۔

"حرام خور۔ گھروں سے بھاگ کر کوٹھے سجانے آ جاتی ہیں خاندانیوں کی گویا بات ہی نہیں۔" اس کے بعد سے پھر کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس روز جب استاد گامی خان گانجا پی کر اٹھنے لگا تو سرداراں نے بڑی ملتجی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "استاد جی! آپ تو جانتے ہیں میرے حالات، کوئی قارون کا خزانہ تو ہے نہیں۔ یہ تو بڑے بوڑھوں کی پونجی تھی اب تو نوبت ادھار پر آ رہی ہے کہیں یہ بھرم ٹوٹ ہی نہ جائے۔ کب بیٹھے گی گڈو مجرے پر۔"

"بی بی!--ساری اولاد ایک سی تو ہونے سے رہی۔ تم جانو میں نے سانولی کو دو ماہ ہی میں سارے نرت بھاؤ بتا دیئے تھے۔ یہ لونڈیا دماغ کی بس ایسی ہی ہے۔ جی جان سے محنت کروا رہا ہوں۔ مولا عباس نے چاہا تو بس اب ایک ڈیڑھ ماہ ہی کی بات ہے۔" استاد

نے بڑی ہمدردی سے کہا۔

"جہاں اتنا کشٹ کٹا۔ مولا نے چاہا تو یہ دن بھی بیت جائیں گے۔" سرداراں نے سرد آہ بھر کر سگریٹ کا لمبا کش لیا۔

بابا مہنگا نے جب اس روز بی بی کو سوگوار دیکھا تو حوصلہ دے کر بولا۔ "اپنی گڈو کو کار میں گھومتا دیکھ لوں اس سے پہلے نہیں مرنے کا میں بھی۔"

"اللہ تیری زبان مبارک کرے بابا۔" سرداراں نے مستقبل کے سنہرے سپنے میں ڈوبتے ہوئے کہا۔

چودھری شفیع نے دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تھے۔ لدھیانہ سے وہ سرداراں کی ماں کو جانتا تھا۔ اسے علم تھا کہ مچھلی کتنے پانی میں ہے۔ پورے بازار کا مانا ہوا تھا۔ بڑی بڑی خاندانی طوائفیں اس کا پانی بھرتی تھیں۔ تھانے کچہری کے معاملے سب وہی نمٹاتا تھا کیونکہ اس کے تعلقات للو پنجو لوگوں سے نہیں، شہر کے راٹھوں سے تھے اور وہ جواب تک لوگوں کے دلوں کی تسکین کا سامان کرتا آیا تھا۔ گڈو کی اٹھان دیکھ کر اپنا دل ہی ہار بیٹھا۔ اسی لئے سرداراں کے پل پل کی خبر تھی اسے۔ ٹال والے پٹھانوں کے ہاں اس کی آمدورفت کا مطلب وہ بخوبی جانتا تھا۔ سود کا روپیہ بانس کے پودے سے زیادہ تیز رفتاری سے بڑھتا ہے۔ اسے علم تھا بازار کی جو عورت اس ٹال پر گئی ہمیشہ کے لئے محتاج ہو کر رہ گئی۔ سو کے دو سو لوٹانے ہوتے تھے۔ گڈو پر اس کی نظریں سانولی کے فرار کے فوراً ہی بعد جم گئی تھیں۔

چودھری شفیع نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی۔ صبح اس نے ٹال والے پٹھان کو سختی سے تقاضہ کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تھا۔

"گھر کی بات ہے بی بی منہ مانگے تو نہیں مناسب رقم دے دوں گا ویسے کام آنے والا بندہ ہوں۔ پھر سارا معاملہ چپ چاپ طے ہو جائے گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ

ہو گی۔" شفیع نے بڑی رازداری سے اسے سمجھایا۔

"چودھری یہ ڈیرے دار کا گھر ہے۔ کسی خانگی کا کوٹھا نہیں۔ آئندہ ایسی بات کبھی بھی منہ سے نکالی تو یاد رکھنا مونچھیں اکھاڑ کر ہاتھ میں دے دوں گی۔"

"تمہاری ماں کے زمانے سے صاحب سلامت چلی آرہی ہے۔ تمہیں اپنی جان کر خود چلا آیا ہوں۔ بڑی بڑی خاندانی طوائفوں کے جوتے گھس جاتے ہیں۔ میرے ڈیرے کے چکر لگاتے بہرحال میری پیشکش موجود ہے جب جی چاہے چلی آنا۔ بس ایک بات یاد رکھنا جو عزت میرے آنے سے تھی وہ تمہارے آنے سے نہیں ہو گی۔ اب ضرورت مند میں ہوں۔ تب تم ہو گی۔" یہ کہہ کر چودھری شفیع اٹھ آیا۔

سرداراں نے حالات کی نزاکت کو جان لیا تھا۔ سارا بازار ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑا تھا۔ سود والے قرض کا معاملہ الگ تھا۔ اب سود خور پٹھان بھی منہ لگنے لگے تھے۔ مزید انتظار اس نے مناسب نہ سمجھا۔

"استاد جی!--- میں نے بچی کو مجرا کروانا ہے کتھک نہیں نچوانا۔"

اس نے اگلے ہی روز فیصلہ کن لہجے میں استاد گامی خان سے کہہ دیا۔

"جو حکم بی بی"--- استاد نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچا۔

اگلے روز گڈو کا مجرا شروع ہو گیا اور آٹھویں ہی روز جب سود خور جان کو آنے لگے تو سرداراں نے اپنی دانست میں بڑا ہی معزز گاہک چنا تھا۔ خوش لباس نوجوان جس نے پہلے ہی روز سے استاد گامی کے ذریعے بات بڑھائی تھی۔ تین ہزار ماہانہ اور بیس ہزار نقد پر معاملہ ٹھہرا تھا۔ زیورات جو اس نے لونڈیا کو پہنانے تھے وہ الگ سے۔

سرداراں نے دشمنوں کو جلانے کا پورا سامان کیا تھا...... سارے بازار کی معزز طوائفیں اس کے کوٹھے پر جمع تھیں۔ خود اس نے بنارسی کام دار ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کے ہونے والے "داماد" نے اسے کل ہی نذر کی تھی۔ ہاتھ میں گولڈ لیف کی ڈبیا

اور گیس لائٹر پکڑے۔ وہ خود تمام کاموں کی نگرانی کر رہی تھی۔ کوٹھا قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ بابا مہنگے نے دھاری دار پاجامہ، سفید کرتے اور چار خانے رومال کے ساتھ پہن رکھا تھا۔ پیروں میں سفید فلیٹ پہنے اس کے خوشی کے مارے پاؤں نہ ٹکتے تھے۔

"ملک جی" نے اسے پورا ایک تولہ افیون لے کر دی تھی۔ صبح جو انعام بی بی اور ملک جی کی طرف سے ملنا تھا وہ الگ، خود اپنے ہاتھ سے کمرہ سجایا تھا اس نے۔!!

بینڈ باجے کے شور میں مائی جیونی نے پلنگ پر سفید چادر خود بچھائی تھی۔ بیس ہزار روپیہ بریف کیس میں پلنگ کے سرہانے رکھی تپائی پر دھرا تھا۔ بریف کیس صبح سب کی موجودگی میں کھلنا تھا تاکہ بعد میں کسی کو باتیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ یہ اس کی خاندانی رسم تھی خود اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

گڈو کو کمرے میں بھیجنے سے پہلے سرداراں نے اکیس سو روپے کی نذر اتاری اور سب کے سامنے پیسے استادوں میں تقسیم کر دیئے۔ جل بھن کر ہی تو رہ گئی تھیں ساری بازار والیاں۔

علی الصبح سرداراں کی آنکھ سیڑھیوں سے اٹھتی "دھڑ دھڑ" کی آواز سے کھلی تھی۔ بازار کی تین چار بوڑھیاں اس کے ہاں ہی سو گئی تھیں تاکہ صحنکی کی رسم ادا ہو جائے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا کہ جیسے وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہی ہے۔ اے۔ ایس۔ آئی اور تین سپاہی ایک دوسرے کے پیچھے وہاں گھس آئے۔ ان سب کا رخ حجلہ عروسی کی طرف تھا۔

سرداراں نے سکتے کے عالم میں انہیں دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ملک جی کو گالیاں دیتے۔ بریف کیس اور زیورات اٹھائے باہر نکل رہے تھے۔

"ابے یہ پولیس ہے یہاں فراڈ کر کے کوئی مائی کا لال کہاں جا سکتا ہے۔" چھوٹے تھانیدار نے اسے گریبان سے پکڑ رکھا تھا اور گالیاں دیتا باہر کھینچ رہا تھا۔

"تم لوگ بھی فوراً تھانے پہنچو۔" اس نے نیم بے ہوش سرداراں کو گھرکی پلائی۔ بابا مہنگا اور استاد گامی کی تقریباً گھنٹے بھر کی جدوجہد کے بعد سرداراں ہوش میں آئی تو اس نے دیکھا سامنے چودھری شفیع بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ سرداراں نے اس کی طرف دیکھا اور شکست خوردہ سی ہو کر نظریں جھکا لیں۔ اگلے روز بابا مہنگا سرداراں کے پیغام کے ساتھ چوہدری شفیع کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

بابرا کی تلاش

چالیس سال ریلوے میں جوتیاں چٹخانے کے بعد میرے والد مرحوم نے سوائے اس کے اور کوئی کارنامہ انجام نہ دیا کہ جاتے جاتے اپنی بلا میرے گلے منڈھ گئے۔ میں نے بارہ سال تعلیم حاصل کر کے دسویں جماعت تھرڈ ڈویژن میں پاس کی تھی۔ پھر ریلوے ملازمین کے "سپیشل کوٹے" کے صدقے کلرک بہادر بن کر اسی دفتر کی فائلوں سے سر پھوڑنے لگا جہاں میرے والد صاحب نے زندگی کا سنیاس بھگتا تھا۔ عموماً ایک کلرک کے گھر پیدا ہونے والا بچہ زیادہ ذہنی اپروچ حاصل نہیں کر پاتا۔ جبکہ بدقسمتی سے اسے ماحول مجھ جیسا میسر آیا ہو، ہم لوگ اندرون شہر کے ایک محلے کی ٹیڑھی میڑھی تنگ و تاریک گلی کے آخری سرے والے تین منزلہ مکان کی درمیانی منزل میں قیام پذیر تھے جہاں شریف آدمی دن کو بھی ٹارچ لئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

"ماں جی آپ کو لاہور میں اور کوئی ڈھنگ کا مکان رہنے کو نہیں ملا۔" میں جب بھی یہ سوال اپنی ماں سے کرتا وہ ایک ہی جواب دیتی۔

"بیٹا وہاں جالندھر میں بھی ہم ایسے ہی محلے میں رہا کرتے تھے۔۔"

ہمارا حال بالکل اس طوطے جیسا تھا جسے پنجرے سے دھکے دے کر باہر نکالو تب بھی وہ واپس اسی میں لوٹ آتا ہے۔ جن لوگوں نے یہاں اپنی ریاستیں قائم کر رکھی

تھیں وہ ادھر کے راٹھ تو تھے نہیں۔ میرے والد صاحب تو بیچارے دس جماعتیں پڑھے ہوئے تھے، لیکن محمد یار کورا ان پڑھ تھا اور جعلی کلیموں پر آدھا محلہ اس نے اپنے نام الاٹ کروا رکھا تھا۔ ہر مہینے کی سات تاریخ کو جب اس کی موٹی بیوی ہم سے کرایہ لینے آتی تو میرا جی چاہتا اس کا پوپلا منہ نوچ لوں جس میں یا تو پان کی پیک بھری رہتی تھی یا پھر سارے محلے کی چغلیاں۔

جس روز والد صاحب میری تقرری کے بعد مجھے اپنے اعلیٰ افسر کے سامنے لے کر پیش ہوئے اور نئے غلام کی حیثیت سے وہاں مجھے متعارف کروایا تو میرے ذہن میں پہلی بات یہی آئی تھی کہ ابھی تک انہوں نے گناہوں کا مکمل کفارہ ادا نہیں کیا باقی کی سزا مجھے بھگتنی ہے۔

"برخوردار تمہارے والد کی نیک نامی اور ایمانداری کا یہاں ہر شخص معترف ہے۔ مجھے امید ہے تم اپنے والد کی روایت کو زندہ رکھو گے۔" خشخشی ڈاڑھی اور گول آنکھوں والے افسر اعلیٰ نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے میری اوقات کا اندازہ لگاتے ہوئے حاکمانہ لہجے میں کہا۔

میرے ذہن میں تو اس کی بات کا کچھ اور جواب آیا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے بڑی عاجزی سے گردن جھکا کر گویا اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اصل میں میرا یہاں صرف ایک ہی "انٹرسٹ" تھا کہ تنخواہوں میں سے سو پچاس تو مجھے مل ہی جایا کریں گے اور پھر "اوپر کی آمدنی" وہ بھی تو ہوتی تھی۔ دفاتر میں۔۔اگر کسی کا باپ پاگل ہو تو اس کا بیٹا پاگل ہونے سے رہا۔ شرافت کے جراثیم خون میں منتقل ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن یہ خون کی طرح جسم کا حصہ نہیں بنے رہتے۔ سکول سے بھاگ کر جب میں باغ کے ایک کونے میں بیٹھ کر سگریٹ پیا کرتا تو میرے لئے دلچسپی کا واحد ذریعہ وہ سکوٹر اور کار سوار ہوتے جن کے پہلوؤں سے قسم قسم کی لڑکیاں برآمد ہو کر ان کے ساتھ

چہلیں کیا کرتی تھیں۔ تب میں سوچتا آخر ان سکوٹر اور کاروں میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں کہ زمانے بھر کی خوبصورت لڑکیاں ان کے ساتھ منہ اٹھائے گھومتی پھرتی ہیں۔ پھر میرا ذہن خود ہی میری بات کا جواب مہیا کر دیتا۔ "پیسہ -- حرام کا پیسہ -- اوپر کی کمائی۔"

"اوئے جا اوئے جھڈو کیا کیا تیرے باپ نے ساری زندگی چالیس سال کلرکی کی اور اپنا مکان نہ بنا سکا۔ پانچ وقت کا نمازی بن کر کوئی مسجد کمیٹی کا ممبر تو نہیں لگ گیا۔ میاں بالا! دیکھ لے سوائے جمعے کے کسی روز نہیں جاتا مسجد میں اور مسجد کمیٹی کا صدر ہے۔ اوئے جا اوئے جھڈو تیرے باپ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا۔" خلیفہ عمر دین ارائیوں کے تھڑے پر لڑکوں کے درمیان بیٹھ کر مجھے ہمیشہ یہی بات کہتا آیا تھا اور یہ تھا بھی سچ۔ اس محنت کا کیا فائدہ جو ثمر آور نہ ہو۔ اگر میرے والد نے ساری زندگی نیکیاں کماتے ہی گزار دی تھی تو وہ محلے کی مسجد کمیٹی کے ممبر کیوں نہ بن سکے!

"اچھا خلیفہ ایک دفعہ مجھے لگ جانے دے کہیں اگر سارے دھونے نہ دھو دیئے تو غلام محمد کا لڑکا نہ کہنا۔" میں چڑ کر جواب دیتا۔

"تو بچہ کیا کرے گا۔ میٹرک تو کرنے سے رہا کہ سرکاری ملازم لگے اور ریڑھی لگانے کے لئے سارے بازار کا کوئی کونہ خالی نہیں بچا۔" گڈی سائیں قریب سے جواب دیتا۔

میں کھسیانہ ہو کر منڈلی سے اٹھ کر گھر چلا آتا اور سارا غصہ ماں سے بحث کر کے نکالنے لگتا۔

"بیٹا تو بھی تو جوان ہے۔ اللہ نے تجھے دماغ بھی دے رکھا ہے تو کچھ کر کے دکھا دے۔ تیرے باپ نے تو پھر بھی دو بیٹیاں بیاہی ہیں اور تیسری پھر سر چڑھی بیٹھی ہے تو ہی ہمت کر اپنا مکان بنا لے۔" ماں زچ ہو کر کہتی اور میں جھنجھلاتا ہوا ڈور گڈی لے کر اوپر کوٹھے پر جا چڑھتا۔

ہمارا مکان تین منزلہ تھا۔ جس میں تین گھرانے قیام پذیر تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کو "ایکتا" کا احساس دلانے کے لئے وہاں کچھ چیزیں مشترکہ تھیں خصوصاً نلکا اور ٹائلٹ، جس پر ہمیشہ سے تینوں کے درمیان لڑائی ہوتی آ رہی تھی اور مستقبل بعید میں بھی اس کے خاتمے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔

نچلی منزل کے دو کمروں میں باؤ رفیق بمعہ اہل و عیال فروکش تھا۔ درمیانی منزل میں ہم اور اوپر والے ایک کمرے میں بابا مہنگا اور بے بے دانی۔ ان محلوں میں ایک دوسرے سے محبت جتنی جلدی ہوتی ہے اتنی تیزی سے پنجابی فلموں میں بھی پروان نہیں چڑھتی۔ باؤ رفیق کی لڑکی بشیراں سیڑھیوں کے ایک کونے میں جہاں انہوں نے چولہا رکھ کر اسے باورچی خانے کی شکل دے رکھی تھی جب دال کو تڑکا لگا کر بگھارتی تو اس کی خوشبو میں نور جہاں کی وہ کڑکدار آواز بھی شامل ہوتی تھی جو اس کے قریب رکھے ٹرانسسٹر سے بلند ہو رہی ہوتی۔ جب بھی کوئی "خاص قسم کا گانا" ریڈیو پر بجتا وہ اس کا پورا والیم کھول دیتی اور اس وقت آواز نیچی نہ کرتی جب تک میری ماں اس کے سرہانے پہنچ کر اسے آگاہ نہ کر دیتی۔ "بیٹی میری نماز کا حرج ہوتا ہے۔"

"توبہ خالہ تم تو ہر وقت نماز ہی پڑھتی رہتی ہو۔" بشیراں شکوے بھرے انداز میں کہتی اور بڑبڑا کر آواز نیچی کر لیتی۔

میں نے اگر لڑکپن میں سکول سے بھاگ کر کمپنی باغ میں چہل قدمی کرتی لڑکیوں کو نہ دیکھا ہوتا تو شاید مجھے وہ سانولی سلونی تیکھے نین نقشوں والی بشیراں غنیمت دکھائی دیتی، لیکن برا ہو ان دوستوں کا جنہوں نے مجھے سکول سے بھاگنا اور بھاگ کر کمپنی باغ میں سگریٹ پی کر چھٹی تک کا وقت گزارنا سکھایا اور میرا دماغ خراب کر دیا۔

نیچے اوپر بشیراں کا آنا جانا تو مختلف کاموں کی وجہ سے لگا ہی رہتا تھا اور میری بہن سے اس کی "دوستی" بھی تھی۔ اس لئے میرا اور اس کا ٹاکرا بھی ہوتا رہتا ایسے ٹکراؤ پر

وہ ہر دفعہ میری طرف کوئی ذو معنی فقرہ ضرور اچھال دیتی۔ اس نے اب تک مجھے کئی مرتبہ ہونٹوں پر مختلف رنگ کی لپ اسٹک اور ناخنوں پر نیل پالش لگانے کے علاوہ گلے اور کانوں میں پیتل اور جعلی نگینوں کے طرح طرح کے زیورات پہن کر بھی دکھائے تھے۔ لیکن میں ان "داؤں" سے ابھی تک صرف اس لئے محفوظ تھا کہ مجھے تو خوب تر کی تلاش تھی۔ مجھے کڑھائی والے رومالوں، پیتل کی انگوٹھیوں، گھٹیا عطر میں لپٹے محبت ناموں یا نور جہاں کی چیختی چلاتی آواز میں نہیں، باغ میں گھومتی پٹاخ پٹاخ باتیں کرتی، کٹے بالوں والی زوردار قہقہے لگاتی لڑکیوں میں دلچسپی تھی۔

میرا مقصود بشیراں نہیں بابرا تھی- بابرا-!

اور ایک روز وہ بابرا مجھے مل گئی۔ مجھے ملازمت کرتے ابھی دو ہی ماہ گزرے تھے، اور تین نئے جوڑے کپڑوں کے میں نے سلوا لئے تھے۔ جب محمد یار کے سامنے والے مکان میں نئے کرائے دار آگئے۔ یہ لوگ "خاصے پڑھے لکھے" تھے اور ماڈرن بھی۔ یہ عقدہ تو کافی دیر بعد کھلا کہ وہ ہمارے محلے میں آئے کیوں تھے؟ پہلے وہ جہاں مقیم تھے وہاں سے انہیں ہاتھ باندھ کر محلے والوں نے رخصت کیا تھا۔

ہماری کھڑکی بالکل اس کمرے کے سامنے کھلتی تھی جسے ان لوگوں نے ایک طرح سے اپنا سیٹنگ روم بنا رکھا تھا۔ میں ذرا قناعت پسند آدمی ہوں۔ اس لئے میں نے صرف "شمع" کا انتخاب کیا تھا ورنہ وہاں تو شمع سے لے کر اجالا تک ہر شے موجود تھی۔

پہلی نظر شمع پر ڈالنے کے بعد مجھے اس بات کا قائل ہونا پڑا کہ سچی محبت واقعی پہلی نظر میں ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کی صرف ایک جھلک دیکھی اور صدق دل سے اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کے نام کا علم مجھے اپنی بہن سے ہوا جب اس نے میری بہن سے تعارف حاصل کیا۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ اسے نگینہ ہونا چاہئے تھا اور ایک روز یہ بات میں نے اس سے کہہ بھی دی۔ وہ اپنی آمد کے تیسرے ہی روز ہمارے گھر آگئی۔

گھر والے قریبی گھر "مولود شریف" پر گئے تھے میں اکیلا ہی شیشے کے سامنے اب تک درجنوں بار اپنا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے کھڑکی سے طلوع ہونے کی دعائیں مانگ چکا تھا۔ جب وہ اچانک سیڑھیوں سے نمودار ہوئی۔

"سلام علیکم"-اس نے مجھے دیکھتے ہی کھٹاک سے کہہ دیا۔

میں نے ہونقوں کی طرح صرف گردن ہلادی۔ بجلی گرنے سے اتنی جلدی تو کسی کا سنبھلنا آسان نہیں ہوتا۔

"منور کہاں ہے!" اس نے تو مجھے سنبھلنے کی مہلت ہی نہ دی۔

"جی بیٹھئے ابھی آتی ہے۔" میں نے بجائے سچ بولنے کے اسے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے خدا جانے یہی سمجھا ہوگا کہ منور اوپر گئی ہے بڑی ادا سے اٹھلاتی ہوئی وہ اسی کرسی پر بیٹھ گئی میں اس کے قریب کھڑا رہا۔ پہلا وار کاری ہو تو شکار بچ نہیں سکتا۔ میرے لاشعور میں سوئے کسی آنہ لائبریری کے ناول کا فقرہ جاگ اٹھا۔ "برخوردار اس سے پہلے کہ چڑیا اڑ جائے جال پھینک دو۔" اندر سے آواز آئی۔

ڈیڑھ دو منٹ جب یونہی گزر گئے تو اس نے میری چوری پکڑ لی۔ "کہاں گئی ہے منور؟"

"دیکھئے اصل میں وہ اماں جی کے ساتھ مولود شریف پر گئی ہے۔ میں نے تو......"

"اوہ--اب میں سمجھی!" اس نے بے باکی سے میرا فقرہ اچک لیا۔

"آپ کا نام شمع ہے نا!" میں نے بوٹ کی ٹو چارپائی کے پائے پر بجاتے ہوئے پوچھا۔

"جی- آپ کو اعتراض ہے کوئی"-اس نے اٹھتے ہوئے مخصوص انداز سے کہا۔

"دراصل آپ کا نام نگینہ ہونا چاہئے تھا۔" میرا حوصلہ اس نے خود ہی بڑھا دیا۔

"جی-وہ کیوں جناب؟" اس نے میری طرف گھومتے ہوئے پوچھا۔

"تاکہ کوئی آپ کو اپنے دل کی انگوٹھی میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لے۔" میں نے خالص فلمی انداز اپنایا۔

اس کے گالوں پر سرخیوں کے بھنورے ناچنے لگے۔ اپنی جھلمل کرتی غزالہ آنکھیں اس نے پٹ سے کھول کر میری طرف دیکھا۔ "آپ شاعری کرتے ہیں یا نوکری" کہہ کر دھڑ دھڑ کرتی وہ نیچے بھاگ گئی۔

شمع کو اپنے خیالوں کے شیش محل میں تو میں نے اسی روز سجا لیا تھا۔ جب اس کی پہلی جھلک دیکھی تھی لیکن اس کے پروانوں کو موت کی راہ پر گامزن کرنے والی روشنیوں کا احساس مجھے آج ہوا تھا۔ وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس کی خاطر دو سلطنتیں آپس میں ٹکرا جاتیں۔ یہاں تو قدم قدم پر اس کے لئے جال بچھے تھے۔ کتنے ہی پروانے اس کے اوپر جل مرنے کو تیار بیٹھے تھے۔ میری چھٹی حس بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ "صاحبزادے ذرا پکے کر کے ہاتھ ڈالنا۔"

میں شیشے کے سامنے سے ہٹا اور کھڑکی کے آگے کرسی بچھا کر اس کی کھڑکی پر نظریں جما کر بیٹھ رہا۔ لیکن وہ پٹ پھر اگلی صبح تک وا نہ ہوئے۔

وہ رات میں نے کانٹوں کی سیج پر کاٹی۔ ساری رات شمع میرے نہاں خانہ دل میں سلگتی رہی اور میں پتنگوں کی طرح اس کا طواف کرتا رہا۔ صبح پھر میں نے کھڑکی سنبھال لی اور ناشتہ بھی وہیں منگوا لیا۔ ابھی چائے کی پیالی میرے ہونٹوں سے لگی ہی تھی کہ سامنے کھڑکی سے چاند نکل آیا۔ میں بھی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے سفید کپڑوں پر سرخ سویٹر پہن رکھا تھا۔ شاید کالج جانے کی تیاری تھی۔ میں نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائے کنکھیوں سے اسے تاکا اور جیسے ہی ہماری نظریں ٹکرائیں میرا ہاتھ سر کے بالوں کا طواف کرنے لگا۔

سلام محبت پیش کرنے کا یہ طریقہ کس نے کب ایجاد کیا تھا؟ اس کا تو مجھے علم نہیں

لیکن اس روز جب شمع نے گردن کو خم دے کر مجھے جواب سے نوازا تو میرے دل سے اس موجد کے لئے دعائیں نکلیں۔ میری رات بھر کی تپسیا بار یاب ہو گئی تو جیسے میں ہلکا ہو کر فضاؤں میں اڑنے لگا۔ میری طرف دیکھ کر اس نے ادائے خاص سے مسکراتے ہوئے اپنے دوپٹے کے پلو کو انگلی پر مروڑا اور نیچے بھاگ گئی۔ اس کی ماں کسی کام سے اس کمرے میں آ گئی تھی۔ میں نے بھی گردن موڑ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

بمشکل دو تین منٹ بعد ہی میدان خالی دیکھ کر وہ پلٹی اور خراماں خراماں چلتی کھڑکی میں آ گئی۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے چور بنے ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اس بات کا ہمیں بخوبی احساس تھا کہ ایسی ہی کئی کھڑکیاں ان سلسلہ ہائے مکانات میں کھلی ہیں اور کسی کی بھی نظر ہم پر پڑ سکتی ہے۔ اس لئے احتیاط کا دامن ہم نے نہ چھوڑا۔

"ذرا منور کو بلا دیں" اس نے خود ہی پہل کی اور آواز اتنی نیچی رکھی کہ دوسرے کمرے میں ریڈیو کے زیر سایہ روٹیاں پکاتی میری بہن تک نہ پہنچ سکے۔

"آپ نے منور ہی سے ملنا ہے؟" میں نے بے اختیار کہہ دیا۔

"آپ تو پاگل ہیں۔" اس نے مجھے احتیاط کا دامن تھامنے کی تلقین کی۔

"ہاں"۔ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کل تک تو نہیں تھا۔" اس کے لب لعلین وا ہوئے اور موتی چمکنے لگے۔

"ہائے اللہ میں کیا بھاگی جا رہی ہوں۔ بلائیے نا پلیز۔" بولنے کا انداز بھی کم بخت کا انہی لڑکیوں جیسا تھا جو میرے دل و دماغ میں رچی بسی تھیں۔ مجھے با دل نخواستہ اس کا پیغام منور کو دینا پڑا، لیکن اس سے پہلے میں نے اسے کہہ دیا کہ میں نیچے گلی میں اس کا منتظر ہوں۔

ایک مرتبہ پھر اپنے چوکھٹے کا شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے تنقیدی جائزہ لیا اور اگلے ہی روز بس میں خریدی دو روپے والی عطر کی شیشی قریباً آدھی اپنے اوپر

انڈیل کر نیچے گلی میں آ گیا۔

محلے سے باہر تک ہم اسی طرح ایک دوسرے کا تعاقب کرتے آئے تھے جیسے دونوں اجنبی ہوں۔ بازار میں پہنچ کر جب تحفظ کا احساس ہوا تو نزدیک آ گئے۔ ہم نے راستے میں بمشکل دو تین فقروں کا تبادلہ کیا تھا۔

میں اس کے کالج کے بس سٹاپ پر ہی اتر گیا اور اسے کالج پہنچانے کے بعد اپنے دفتر گیا دفتر میں کام تو کیا خاک کرتا بس شمع ہی سارا دن خیالوں پر چھائی رہی۔ میرے والد کی سابقہ ایماندارانہ خدمات کے پیش نظر مجھے افسر اعلیٰ نے حساس قسم کی سیٹ پر بٹھایا تھا۔ جہاں پبلک ڈیلنگ کچھ زیادہ ہی رہتی تھی۔ میں نے "بخشیش" یا "انعام" پکڑنے میں کبھی بخل کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بات ہمیشہ مد نظر رکھی کہ کامیابی کا راز خرگوش کی طرح قلانچیں بھرنے میں نہیں۔ کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر چلنے میں ہے۔ میں صرف خاص لوگوں سے انعام قبول کرتا وہ بھی اتنی احتیاط سے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پاتی۔ دوسرے ساتھی بھی مجھے اس لئے نظرانداز کر دیتے کہ میں بہرحال "مولوی صاحب" کا بیٹا تھا جن کی ایمانداری کی دھوم سارے دفتر میں مچی تھی۔

اس روز پہلی مرتبہ میں نے بجائے ڈرنے کے ذرا کھلے دل سے انعامات اور بخششیں وصول کیں۔ خود کسی سے تقاضہ نہ کیا البتہ کسی کو مایوس بھی نہ ہونے دیا۔ چھٹی تک میری جیب میں قریباً ستر اسی روپے اکٹھے ہو چکے تھے جو میرے لئے قارون کے خزانے سے کم نہ تھے۔ شام کو جب میں گھر پہنچا تو میری جیب میں اس کے لئے ایک خوبصورت اور قیمتی انگوٹھی موجود تھی۔

رات کو میں نے میدان صاف پا کر کاغذ کے ایک محبت نامے میں وہ انگوٹھی لپیٹ کر اس کی طرف اچھال دی۔ شمع نے فوراً دونوں چیزیں اٹھا کر مٹھی میں چھپا لیں اور وہاں سے چلی گئی۔ شاید چھپ کر اپنے شکار کے پہلے "نذرانے" کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

واپسی پر اس کے انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ اس نے وہ جگمگاتی انگوٹھی اپنی انگلی میں سجا رکھی تھی۔ اسے چومتے ہوئے شمع نے جھک کر ادائے دلبرانہ سے میرا شکریہ ادا کیا اور واپس چلی گئی۔

پھر تو جیسے یہ میر معمول بن گیا۔ تحفے دینے سے لب لعلین کی مسکراہٹ چرانے تک کے مراحل ہم نے بڑی تیز رفتاری سے طے کر لئے۔ محتاط میں دفتر میں ہیرا پھیری کرتے وقت بھی اتنا ہی ہوا کرتا تھا جتنا اس سے ملتے وقت، میری بہن اس کی سہیلی تھی لیکن بشیراں کی طرح اسے بھی ہماری خاموش محبت کا علم نہیں تھا۔

بشیراں نے البتہ ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس نے ہارنا شاید سیکھا ہی نہیں تھا۔ شمع کا ہمارے وہاں آنا جانا اسے کھٹکا ضرور ہوگا۔ لیکن میری مسلسل بے نیازی کی شاندار ایکٹنگ نے اسے کبھی شک نہ ہونے دیا۔

ابتدائے آفرینش سے انسان کی گھٹی میں جو قبائلی نظام زندگی سمایا ہوا ہے وہ جدید تہذیب کی چمک دمک کے سامنے کسی حد تک ماند تو پڑ گیا ہے۔ لیکن حکومت کی خواہش سے شاید کبھی انسان کو چھٹکارا نصیب نہ ہو سکے گا۔ محمد یار کے نزدیک بھی ہمارا محلہ اسکی ذیلی ریاست تھی اور اس کے لڑکے کو سربراہ مملکت ہونے کے ناطے اپنے مکانوں میں رہنے والے کرایہ داروں پر مکمل حق حاصل تھا۔ اپنے مکانات میں بسنے والی تمام مخلوق کو اس کے مادی وسائل سمیت وہ اپنی جاگیر جانتے تھے اور یہ حقوق ملکیت "بلاشرکت غیرے" قسم کے تھے۔ میں چونکہ "پہلے آئے پہلے پائے" کا قائل تھا۔ اس لئے یہ بات فراموش کر گیا کہ شمع اور اس کے گھر والے محمد یار کے کرایہ دار ہیں پھر میرے خیال میں ہم رازداری ہی اتنی زیادہ برت رہے تھے کہ کسی کے شک کرنے کے امکانات صفر کے برابر رہ جاتے تھے۔

ہمارے محلے کی سیاسی اور سماجی قریباً سبھی قسم کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز

حمیدے نائی کی دکان تھی جس کے باہر لگے تھڑے پر محلے کے لڑکے سارا دن چرس پیتے رہتے اور اندر محلے کی اندرونی اور بیرونی سیاست پر تازہ ترین تبصرے کئے جاتے۔ وہ شاید ہمارے محلے کا سب سے زیادہ باخبر آدمی تھا جس کو فلاں کی لڑکی کے فلاں لڑکے سے معاشقے سے لے کر اس بات کا علم ہوتا تھا کہ مستقبل میں ان کا عشق کیا رنگ لانے والا ہے۔ حمیدا نائی بڑا زمانہ شناس آدمی تھا جس کا ثبوت اس کی دکان کے ایک کونے میں حالات کے مطابق بدلتی رہنے والی لیڈروں کی تصاویر سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

اس روز جب میں صبح صبح شیو کروانے اس کی دکان پر گیا تو وہاں محمد یار کا لڑکا چھدو بھی موجود تھا۔

”واہ جی مولوی صاحب (مجھے والد صاحب کی نسبت سے محلے میں مولوی صاحب ہی کہتے تھے) بڑا لمبا ہاتھ مارا ہے۔“ حمیدے نائی نے استرا میری گالوں پر چلاتے ہوئے کہا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے میری شاہ رگ کاٹ دی ہو۔

”کیا مطلب؟“ میں نے سب کچھ سمجھتے بوجھتے ہوئے حواس باختہ لہجے میں کہا۔

”مطلب تو بچو تجھے ابھی بتا دیتا۔ ذرا مولوی جی سے بات کرلوں۔“ بجائے حمیدے کے چھدو نے جواب دیا۔

”میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرو“...... میں تولیہ ایک طرف پھینکتے ہوئے پھنکارا۔

”بہن کی آڑ میں عاشقی کر رہا ہے سالا بڑا آیا مولوی کا بیٹا۔“ وہ تو پہلے ہی تیاری کر کے آیا تھا۔

”تمہاری ایسی کی تیسی“ میرا خون کھول اٹھا۔

ہم آپس میں جت گئے۔ اکیلا چھدو بے چارہ میرا کیا بگاڑ تا۔ چرس نوشی نے اس کی ہڈیوں کا گودا بھی جلا دیا تھا۔

”چھوڑو مہر جی جانے دو--- اوئے تو بھی بس کر اوئے مولوی۔“ حمید نے

ہمارے درمیان آتے ہوئے کہا۔ محلے کے دو تین اوو بزرگ وہاں گھس آئے اور ہمیں علیحدہ کر دیا۔

یہاں تو خیریت رہی لیکن حمیدے نائی کے سیاسی ہیڈ کوارٹر سے جو اعلان چھدو نے نشر کر دیا تھا اس سے محلے کے در و بام گونجنے لگے۔

شام کی نماز سے فارغ ہو کر والد گھر آئے تو مجھے لے کر بیٹھ گئے۔

”بیٹا ہمارے پاس نیک نامی کے علاوہ اور ہے ہی کیا؟-- میری ساری زندگی کی یہی تو کمائی ہے بیٹا تم اسے مٹا دینے پر تلے ہو۔“

”ابا جی اپنے پاس رکھئے اپنی نیک نامی میں کسی سے دبنے والا نہیں۔ میری طرف سے چھدو چھوڑ اس کا باپ بھی آ جائے۔ اگر کوئی میرے منہ لگا تو اس کا منہ توڑ دوں گا۔“ میں گلہ پھاڑ کر چلایا۔ کیونکہ سامنے کھڑکی میں لٹکتی چق پر میں نے شمع کی لرزتی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں اور اپنی محبوبہ کے سامنے شکست تسلیم کرنا میری مردانگی کی توہین تھی۔

”تم ہی سمجھاؤ اسے عقل دو اس کو میری چٹی ڈاڑھی میں مٹی نہ ڈالے۔“ والد نے ہمیشہ کی طرح معاملہ اماں پر چھوڑ دیا اور خود پیر پٹختے باہر نکل گئے۔

ماں آخر ماں ہے-- بے چاری میرے آگے ہاتھ باندھنے لگی۔ ”بیٹا ان کے منہ نہ لگ بڑے ظالم ہیں بیٹا۔ ہم بے چارے تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے ان کے سامنے!“

اماں ہوئی تو بشیراں بھی ”کسی کام“ سے اوپر آ گئی۔ وہ کچھ الجھی الجھی اور غمزدہ سی دکھائی دے رہی تھی، بالکل یوں جیسے کسی نے اس سے کچھ چھین لیا ہو۔

”ایک بات پوچھوں وسیم“ اس نے دروازے کے پٹ کا سہارا لیتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ہاں ضرور پوچھو۔ ایک تمہاری ہی کسر تو رہ گئی تھی۔“ میں نے تلملا کر جواب دیا۔

"تم تو خواہ مخواہ غصہ کر جاتے ہو۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا جو تمہیں میری بات بھی بری لگنے لگی۔" اس نے قریباً روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

جانے کیوں مجھے اس روز اس سانولی سی کمزور لڑکی پر ترس آ گیا۔ "اچھا بابا پوچھو؟"

"یہ جو بات محلے میں پھیلی ہوئی ہے کیا سچ ہے؟" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"محلے میں تو روزانہ نئی بات سننے کو ملتی ہے۔ وہ کیا ساری باتیں سچی ہوتی ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی تمہاری زبان سے......" اس نے امید بھری نظریں مجھ پر جمائیں۔

"یا اللہ تو ہی ان لوگوں کو سمجھا۔" جانے کیوں اس لمحے میں اس کے سامنے جھوٹ نہ بول سکا اور گول مول سی بات کر دی۔

"کیا ہوا بیٹا۔ کون ہے" دوسرے کمرے سے ماں جی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے ابھی ابھی سلام پھیرا تھا۔

"میں ہوں خالہ۔ ہلدی کو پوچھ رہی تھی۔" بشیراں کی آواز کی چلبلاہٹ لوٹ آئی۔

صبح جب میں کام پر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو میرے اور شمع کے تعاقب میں چھدو اور محلے کے دو اور لڑکے بھی آ رہے تھے۔ اس بات کو شمع نے مجھ سے پہلے محسوس کر لیا وہ بڑی "سیانی" لڑکی تھی اور جس ماحول میں پرورش پا رہی تھی وہاں تو مزا ہی ایسے کھیل میں آیا کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی بس میں جایا کرتے تھے۔ یہی بس اس کے کالج سے گزر کر میرے دفتر جاتی تھی۔ ہم دونوں نے ہی ان کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی بس میں سوار ہو گئے۔ لیکن اترتے وقت کمال ہشیاری سے شمع نے میری طرف یہ پیغام اچھال دیا کہ میں گیارہ بجے اس سے یہیں ملوں۔ مجھے دفتر تک پہنچا کر وہ دونوں دفع ہو گئے۔

گیارہ بجنے ہی میں نہیں آ رہے تھے۔ خدا خدا کر کے ملاپ کی گھڑی آئی۔ کالج کے دروازے سے ہی میں نے اسے برآمد ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سنبھل کر اور محتاط انداز میں چاروں اطراف کا جائزہ لیتی ہوئی اس طرف آ رہی تھی۔

ہم دونوں ایک رکشہ میں بیٹھ کر اپنے مخصوص ہوٹل پہنچ گئے۔ یہاں اس سے پہلے بھی ہم کئی مرتبہ آ چکے تھے۔

"وسیم--- ساری دنیا ایک طرف ہو جائے تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم دل نہ چھوٹا کرنا میں تمہاری خاطر سارے زمانے سے ٹکرا سکتی ہوں۔" اس کی آواز میں بے پناہ اعتماد تھا۔

اس دن کے بعد سے ہمارا چھپ چھپ کر ملنا کچھ زیادہ بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تحائف کی رفتار میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اصل میں شمع کے جوہر اب کھلنے لگے تھے اور اس کے گھرانے نے بھی اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد اپنی اصلیت دکھانی شروع کی تھی۔ محلے کے امیر لڑکوں کی آمدورفت وہاں لگی رہتی تھی۔ کوئی کسی کا بھائی بنا تھا کوئی کسی کی بہن اور کسی نے اس کی ماں کو خالہ بنا رکھا تھا۔ ان آنے جانے والوں میں چھدو بھی شامل تھا اور اس کی آمدورفت کا مطلب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں تھا۔

شمع کے چھوٹے بھائی کی سالگرہ ہوئی تو محلے بھر کے "بھائی جانوں" نے اسے تحائف سے لاد دیا پھر تو آئے روز کسی نہ کسی بہانے ان کے ہاں کچھ نہ کچھ ہنگامہ معمول سا بن گیا۔

چھدو کے غنڈے اس دوران میں تین چار مرتبہ مجھ سے ٹکرا چکے تھے۔ ہمارا یہ ٹاکرا عموماً محلے سے باہر ہی ہوا کرتا تھا۔ میں چونکہ سچا عاشق تھا اور سچے عاشق وریام بھی ہوتے ہیں اس لئے کبھی کسی بات سے نہ گھبرایا۔ جہاں ان کا بس چلا انہوں نے کھل کر دل کے ارمان نکالے اور جہاں کوئی اکیلے دکیلے میرے قابو آ گیا میں نے سب کا حساب

چکالیا۔ ہمارے درمیان ایک قسم کا یہ ملزمانہ معاہدہ طے پا گیا کہ ہم نے محلے کو کبھی کارزار نہ بنایا۔ یہ الگ بات کہ حمیدے نائی کو بہر حال ان سب باتوں کی خبر رہتی تھی۔

ایک روز جب میں بال ترشوانے اس کے پاس بیٹھا تھا اور اتفاق سے وہاں اور کوئی تھا بھی نہیں تو اس نے بڑی رازداری سے کہا۔ "مولوی بچو تیرے ساتھ جو کھیل ہو رہا ہے نا اس کا علم تجھے تب ہو گا جب چھولے بک جائیں گے۔ اب بھی موقعہ ہے، بچو سنبھل جا۔ بندہ بن جا۔ یہ زمانہ قیس، لیلیٰ یا ہیر رانجھے والا نہیں۔ یہ سارا ڈرامہ وہ اپنی ماں کے اشارے پر کر رہی ہے۔ جس طرح اسے ہدایت ملتی ہے اسی طرح وہ عمل پیرا ہوتی ہے تو شریف اور ایماندار گھرانے کا بچہ ہے جس دن دفتر سے کی گئی کوئی ہیرا پھیری پکڑی گئی اس روز اپنے گھرانے کے کسی فرد کی چھٹی سمجھ لینا۔ یہ اڑتی چڑیاں ہیں بچو ان کو دور ہی سے دیکھ کر خوش ہونا چاہئے۔ قریب جا کر پکڑنے کی حماقت کبھی نہ کرنا۔"

اس وقت تو یہی بات ہے میرا جی چاہتا تھا کہ حمیدے نائی کا منہ نوچ لوں جو ایسی پاکباز عورتوں پر الزام تراشی کر رہا تھا۔ ممکن ہے میں ایسا کر بھی گزرتا، لیکن یہ سوچ کر یہ تو اس کی فطرت ہے میں چپکا ہو رہا اور اس سے کچھ کہے سنے بغیر واپس آ گیا۔

شمع نے واقعی جو کہا کر دکھایا آٹھویں دسویں روز وہ خود پر ٹوٹنے والے ظلم و ستم کی نئی کہانی سنا کر مجھ سے کوئی سوٹ یا اور چیز اینٹھ لیتی۔ جس شدت سے اس کے ساتھ میری محبت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اسی تیز رفتاری سے میری دفتر میں بدعنوانیاں بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر ایک روز وہ بھی آیا جب لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ تو باپ کے بالکل ہی الٹ نکلا۔ مجھے ان باتوں کی پرواہ تھی ہی کب؟ مجھے تو اس بات کی بھی پرواہ نہیں تھی کہ گھر میں کوٹھے جتنی جوان بہن بیٹھی ہے جس کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں ماں باپ گھلے جا رہے ہیں۔ والد صاحب کے جمع شدہ فنڈز واگزار ہونے والے تھے۔ جب بھی سویا ہوا ضمیر انگڑائی لیتا میں اسے انہی فنڈز کا لارا لپا لگا کر سلیپنگ پلز مہیا

کر دیتا۔ اور کون سے ہم نے گریجویٹی کے پیسوں سے محل خریدنے تھے۔ یہ سارا پیسہ بہن کے ہاتھ پیلے کرنے ہی کے لئے تو تھا۔

ایک روز جب میں اور شمع ایک ریستوران سے برآمد ہو رہے تھے تو محلے کے ایک بزرگ کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ یہ بزرگ میرے والد سے کچھ فروعی اختلافات رکھنے کی وجہ سے ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان رہتے تھے اور کبھی کوئی موقعہ ہمیں نیچا دکھانے کا ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

انہوں نے حمیدے نائی کے حمام پر بات پہنچا کر اپنا بوجھ ہلکا کیا اور حمیدے نے حسب توفیق اسے تبرک کی طرح محلے کے باقی لوگوں کے منہ میں ڈال دیا۔ چھدو نے خالہ (شمع کی والدہ) کے گھر تحائف کے ڈھیر لگا دیئے تھے اور خالہ نے اسے "بیٹا" بنا لیا تھا۔ اس لئے اسے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہونا فطری بات تھی۔ اگلے روز وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کرائے کی ٹیکسی میں ہمارا تعاقب کرتا رہا۔ ان لوگوں نے کسی کارنامے کی امید پر ہمارا پیچھا نہ چھوڑا اور حسب پروگرام جب شمع اپنے کالج سے اور میں اپنے دفتر سے بہانہ کرنے کے بعد ایک ٹھکانے پر ملنے لگے تو وہ ہماری جان کو آ گئے۔

اس روز میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ تین چار روز سے مسلسل بخار آ رہا تھا اور میں بجائے آرام کرنے کے اس "راحت جان" کے کالج کے طواف کرنے میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہا تھا۔

"حرامی! محلے کی دھی بہن کے ساتھ گلچھرے اڑاتے تجھے شرم نہیں آتی۔" چھدو نے مجھے للکارا۔ اور اس کے سدھائے ہوئے کتے مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے وہاں موجود لوگوں کی ہمدردیاں بھی اس "کار خیر" میں شرکت کے لئے حاصل کر لیں اور لوگوں کی "ہلا شیری" پر کچھ زیادہ ہی ہاتھ چلانے لگے۔ پھر وہ مجھے آدھ موا کر کے وہیں پھینک گئے۔ خیریت یہ گزری کہ تھانے کی یاترا سے بچ گیا۔ اس سارے واقعے کا

دلچسپ پہلو یہ تھا کہ شمع وہاں سے یوں غائب ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

میں شرم سے پانی پانی اور زخموں سے چور اٹھا، ایک رکشہ کے ذریعے گرتا پڑتا گھر جا پہنچا۔ گھر والے کسی کام سے گئے تھے۔ بشیراں نے مجھے اس حال میں دیکھا تو بے قرار ہو کر اوپر چلی آئی۔ میرا سارا جسم بخار میں پھنک رہا تھا اور تن بدن کا ہوش نہیں تھا اماں کے آنے تک وہ میری خدمت میں جتی رہی اس نے میرے دکھ کو اپنی جان کا روگ بنا لیا۔

میں نے اسے تو یہی بتایا تھا کہ راستے میں غنڈوں سے جھگڑا ہو گیا، لیکن بات حمیدے نائی کے ہیڈ کوارٹر میں پہنچ چکی تھی اور محلے کی تین چار عورتیں بھی اس واقعہ کی تحقیق فرمانے کے لئے ہمارے گھر آ چکی تھیں۔ ان کی "عین الیقین" گواہیاں جنگل کی آگ کی طرح محلے کے گھر گھر میں پھیل گئیں اور لوگ مولوی صاحب کے نافرمان اور نالائق بیٹے کو لعن طعن کرنے لگے جبکہ چھدو محلے کا ہیرو بن گیا کیونکہ اس نے کمال دانائی سے کام لے کر محلے کی عزت بچالی تھی۔

وہ رات بشیراں نے تمام حیا و حجاب بالائے طاق رکھ کر میرے سرہانے بسر کر دی۔ وہ شاید محلے کی واحد ہستی تھی جس نے میرے بیان کی حمایت کی تھی کہ یہ سب کچھ چھدو کی چال ہے۔ وہ مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے۔ اس روز والد نے پہلی مرتبہ دل میں درد کی شکایت کی اور ان پر معمولی سا دورہ بھی پڑا۔ بشیراں کی دیوانہ وار چاہت اور گھر والوں کی حالت زار دیکھ کر میرے ذہن میں یہ بات ضرور آئی کہ شمع آخر میرے ساتھ کیوں نہ کھڑی ہوئی وہ کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ آئی؟ صبح کھڑکی کے راستے شمع کا رقعہ مل گیا لکھا تھا۔

"مجھے بے وفا نہ سمجھنا۔ اگر میں وہاں رہ جاتی تو شاید ہم زندگی بھر دوبارہ نہ مل پاتے۔ میں نے اپنی ماں سے یہاں کہا ہے کہ میں تمہارے ساتھ تھی ہی نہیں اور وہاں سے بھاگ کر کالج واپس آ گئی تھی۔ آخری پیریڈ میں میری "پراکسی" اس بات کا ثبوت

موجود ہے کہ میں کالج سے باہر گئی ہی نہیں تم بھی اسی بات پر قائم رہنا۔ میں تمہاری ہوں اور قیامت تک تمہاری رہوں گی۔"

شمع کا خط پڑھ کر میں خود کو کوسنے لگا کہ کیوں میں نے اپنی معصوم محبت پر شک کیا؟ اس نے کس طرح کمال ہشیاری سے مجھے بدنامی سے بچا لیا تھا۔ اس واقعہ نے میرے دل میں اس کے لئے محبت کے ساتھ عقیدت بھی پیدا کر دی اور میرا مورال کچھ ہی زیادہ بلند ہو گیا۔ میری توقعات کے مطابق اس روز مہر محمد یار کے گھر بیٹھک جمی۔ بزرگ نے گواہی گزاری اور بتایا کہ بچشم خود اس نے مجھے اور شمع کو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھومتے دیکھا ہے پھر چھدو اور اس کے چمچے بھگتے۔ کسی سیانے نے وہاں شمع یا مجھ سے گواہی نہ مانگی۔ جب میں نے بدتمیزی کرتے ہوئے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تو مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا اور محلے کے معززین نے فیصلہ دیا کہ مولوی صاحب کی سابقہ شرافت کے پیش نظر فی الحال تو وہ خاموش رہتے ہیں۔ لیکن آئندہ اگر ان کے لونڈے نے محلے کی شرافت پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی تو سخت قدم اٹھائیں گے۔

والد صاحب سر جھکائے گھر آ گئے۔ انہوں نے قریباً روہانسے ہو کر کہا۔ "مولا مجھے بچیاں تو تو نے دی ہی تھیں، چوتھی بھی لڑکی ہی دے دیتا تو یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" وقتی طور پر تو ان کی آواز نے مجھے رلا دیا۔ واقعی میں نے ان کی مٹی پلید کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے ان سے سابقہ سلوک پر معافی مانگی۔ تو بیچارے کسی حد تک مطمئن ہو کر بیٹھ رہے۔

قریباً دس پندرہ دن تک شمع میرے سامنے نہ آئی۔ کھڑکی کے سامنے پڑی چق جیسے سنگلاخ دیوار بن کر رہ گئی۔ ان کے گھر پر ایک پراسرار سناٹا چھایا رہتا۔ یوں لگتا جیسے ابھی ابھی یہاں کوئی جنازہ اٹھا ہو۔ پھر ایک روز اس کا ٹیلی فون میرے دفتر میں آ گیا۔

"خدا کے لئے مجھے شیراز ریسٹورنٹ میں ملو۔ ابھی۔ اسی وقت میں بڑی مشکل سے

بھاگ کر آئی ہوں۔" فون کریڈل پر رکھتے ہی میں اس سے ملنے کے لئے بھاگ اٹھا۔

شیراز ریسٹورنٹ میں وہ میری منتظر تھی۔ ایک سہیلی بھی اس کے ساتھ تھی جس کے ساتھ جانے کا بہانہ کر کے وہ "ظالم سماج" کے چنگل سے بمشکل نکل کر مجھ تک پہنچی تھی۔

"وسیم میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔ تمہیں سب کچھ سچ سچ بتادوں گی۔ میرے ماں باپ بہت ظالم ہیں وسیم بہت لالچی۔ اگلے ہفتے باجی کی شادی ہے۔ خدا کے لئے کسی نہ کسی طرح باجی کو دینے کے لئے ایک فریج کا بندوبست کرلو تاکہ تم میری لالچی ماں کی ہمدردیاں حاصل کر سکو۔ باقی بات میں خود کرلوں گی۔ وسیم! میری نیت پر شک نہ کرنا اگر تم چاہو تو ہم بھاگ کر سول میرج کرلیں۔ لیکن زمانے کو تم بھی مجھ سے بہت زیادہ بہتر سمجھتے ہو۔ تم جس طرح کہو تمہاری شمع تیار ہے۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا سر اپنی سہیلی کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر میرے بازو پر رکھ دیا۔

"حوصلہ کرو شمع کیا ہوا۔ تمہارے پیار کی خاطر یہ بھی سہی۔" میں نے اسے تسلی دی بمشکل اس کے آنسو تھمے۔

"بھائی جان اس چھدو کے بچے نے پہلے ہی ایک ٹیلی ویژن خالہ کے پاس پہنچادیا ہے اور جلد ہی وہ شمع کا رشتہ بھی مانگنے والا ہے۔" جلتی پر تیل کا کام اس کی سہیلی نے کیا۔ میرا جی چاہا ابھی جاؤں اور اس بدمعاش کو گولی ماردوں، لیکن شمع نے ہاتھ باندھ کر مجھے کوئی بھی جذباتی قدم اٹھانے سے باز رکھا۔

"شمع ہو گی تو وسیم کی ورنہ کسی کی نہیں رہے گی۔" جاتے جاتے اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔

گھر پہنچ کر میرے ذہن پر صرف ایک ہی بات سوار تھی کہ میں نے سات آٹھ ہزار روپے کا بندوبست کرنا ہے تاکہ اس کی لالچی ماں کے منہ میں سونے کا نوالہ دے

سکوں۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گئے۔ میں ہر قیمت پر کامیابی چاہتا تھا۔ ابھی اتنا بے غیرت نہیں بنا تھا کہ بہن کے لئے بنائے ہوئے زیور بیچ ڈالوں۔ صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا سو دو سو کے بجائے آٹھ دس ہزار کا لمبا ہاتھ مارنے کا -!

پھر وہ موقع بھی بدقسمتی سے ہاتھ آگیا۔ میں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھیں اور ہاتھ دکھادیا۔ دس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہوتی۔ نوٹ جیب میں رکھ کر سیدھا اس کی ماں تک جا پہنچا۔

خرانٹ عورت نے مچھلی کو شکار میں پھنسے دیکھا تو دونوں بانہیں پھیلا کر مجھے شرافت اور انسانیت سے بانجھ سینے سے چمٹالیا۔

"میرا بیٹا! میرا بیٹا" اس کے منہ پر ایک ہی لفظ تھا اور میں حیرانگی سے اس کی شکل دیکھے جارہا تھا کہ اس ہوس کے کوہ گراں کو سر کس نے کیا۔ پھر شمع کا جگمگاتا چہرہ دکھائی دیا تو بات سمجھ آگئی میں نے سوچا آٹھ ہزار میں کسی کو گوہر مقصود مل جائے تو اور کیا لینا ہے۔ اس نے زندگی سے۔

شمع نے بتایا کہ جیسے ہی وہ بی اے پاس کرے گی میری شادی اس سے ہو جائے گی۔ اس نے اپنی ماں کو خودکشی کی دھمکی دے کر منالیا اور فی الحال مجھے رشتے کی بات کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے لئے کسی مناسب موقع کی وہ منتظر تھی۔

اس سارے ڈرامے کو جس خوبصورتی سے ان ماں بیٹی نے نبھایا وہ کچھ انہی کا کام ہے۔ میں نے بجائے فریج کے آٹھ ہزار نقد اس کی ماں کو پیش کر دیا جو اس نے بڑی منتیں کروانے کے بعد مجھ سے وصول کیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے "منہ بولا بیٹا" بنالیا۔

جب میں اندھا دھند اپنی حرامکاریوں میں مصروف تھا تو میرے ساتھ والے اس لئے خاموش رہتے تھے کہ میری آڑ میں وہ بھی شکار کھیل رہے تھے۔ ہم پرچیز سیکشن میں کام کرتے تھے۔ میں اگر سو کی بے ایمانی کرتا تو وہ کمال ہشیاری سے پانچ چھ سو یا سات

سو تک پہنچادی جاتی۔ سو دن چور کا اور ایک دن سادھ کا۔ بالآخر وہ روز بد بھی آ گیا جب میرے بنائے ہوئے بوگس ووچر پکڑے گئے اور افسر مجاز نے بغیر کسی حیل و حجت کے کیس پولیس کے سپرد کر دیا۔ جہاں اس انکشاف نے مجھ پر بجلی گرادی کہ میں اب تک ڈیڑھ لاکھ روپے کا غبن کر چکا ہوں۔

گھر یہ خبر پہنچی تو کہرام مچ گیا۔ والد پر دل کا شدید دورہ پڑا۔ بمشکل جانبر ہوئے۔ تھانے میں شمع کا والد مجھ سے ملنے آیا۔ وہ لوگ تو ان معاملات کے ماہر تھے۔ اس نے مجھے کہا کہ فی الحال میں پولیس کے کہنے کے مطابق بیان دے دوں۔ ریمانڈ ختم ہوتے ہی وہ میری ضمانت کروالے گا اور ایک چھوڑ ہزار نوکریاں میرے لئے تیار ہیں۔ صدمے اور خوف کی شدت سے میں حواس باختہ ہو رہا تھا مجھے پولیس کی کارروائیوں اور چالاکیوں کا کیا علم؟ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ شمع کا والد پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔

میں وہی کچھ کرتا رہا جو کچھ وہ مجھے کہتا رہا۔ ریمانڈ کے خاتمے پر مجھے جیل بھیج دیا گیا۔ تھانے میں شمع کے والد نے والدہ سے میری ملاقات بھی کروادی اور انہیں ہر طرح تعاون کا یقین بھی دلا دیا۔ جوڈیشنل ریمانڈ میں جیل تو آ گیا لیکن ضمانت کبھی نہ ہو سکی۔ والد تو اس صدمے سے مستقل چارپائی سے لگ گئے۔ دل کا عارضہ ان کے نحیف وجود کو کھانے لگا۔

میرا مقدمہ تین چار ماہ تک چلا۔ اس دوران ہر تاریخ پر باقاعدگی سے شمع کا باپ مجھے ملنے آتا رہا۔ اسے شک تھا کہیں میں بدک نہ جاؤں اور آٹھ ہزار روپے کا ذکر نہ کر دوں۔ والد صاحب میں اتنی سکت رہ ہی نہیں گئی تھی کہ وہ مجھے ملنے آتے یا شاید اب وہ اپنے نالائق بیٹے کا منہ ہی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ماں نے وکیل بھی شمع کے باپ کی مرضی سے کیا اور میرے "نہ"، "نہ" کرنے کے باوجود جمع پونجی میرے مقدمے کی نذر کر دی۔ ہاں اس دوران ایک ہستی ایسی ضرور تھی جس نے مجھے فراموش نہ کیا اور وہ

تھی بشیراں۔

وہ ہر تاریخ پر زبردستی ماں کے ساتھ آتی۔ میرے لئے کھانا بنا کر لاتی اور حوصلہ قائم رکھنے کی تلقین کرتی۔ تین ماہ بعد پولیس نے مجھ سے اقبال جرم کروالیا اور بجائے مجھے بری کروانے کے پانچ سال قید کی سزا دلوادی۔ والد صاحب نے تو جیسے ہی یہ سنا اپنی جان جانِ آفریں کو سونپ کر خلاصی کروالی۔

چار سال میں جیل کے جہنم میں جلتا رہا۔ کسی نے دوبارہ پلٹ کر خبر نہ لی۔ صرف ایک دفعہ حمید انائی آیا۔ "بچو ہم نہ کہتے تھے یہ اڑتی چڑیاں ہیں ان کو دور ہی سے دیکھا کرو!"

"ہاں چاچا تم ٹھیک کہتے تھے۔" میں نے ہتھیار پھینک دیئے۔

"اب پڑ گئی ہے تو مرد بن کر جھیلو۔" مجھے تسلیاں دے کر وہ بھی چلا گیا۔ چار سال تک ماں نے صرف والد کی پنشن پر اپنا اور میری بہن کے جسم و جاں کا رشتہ باقی رکھا۔ منور نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر کپڑے سی کر کسی نہ کسی طور پر چار سال پورے کئے۔

جیل میں بہتر کارکردگی کے مظاہرے پر مجھے سال کی معافی مل گئی۔ میں پرسوں رہا ہو جاؤں گا شمع دو بچوں کی ماں بن کر کراچی کی ایک ماڈرن آبادی کے فلیٹ میں گلچھرے اڑا رہی ہے۔ بشیراں کی شادی گوجرانوالہ میں اس کے رشتے داروں کے ہاں پچھلے سال ہو چکی ہے۔ اس نے تین سال میرا انتظار کیا۔ لیکن عورت بے بس ہوتی ہے بالآخر ماں باپ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

جب والد زندہ تھے تو کبھی ان کی پرواہ نہ کی۔ سوچتا ہوں اب ان کی قبر پر کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ زندگی تو میرے لئے کبھی کی شام غریباں بن چکی ہے۔ زندہ رہنے کے لئے خود سے کیا کومٹ منٹ کروں اور کیسے؟ یہ سوال مجھے پچھلے چار سال سے ڈس رہا ہے۔ حقائق شکاری کتوں کی طرح میرا تعاقب کر رہے ہیں اور میں خوفزدہ خرگوش کی طرح بھاگ رہا ہوں۔

لہردار پانیوں کی کڑواہٹ

دونوں سات سال بعد اچانک ہی ہوائی اڈے کے لاؤنج میں ملے تھے۔ راشد وہاں کسی کام سے آیا تھا اور وہ ایمسٹرڈیم سے واپس آ رہی تھی۔ جس دروازے سے سارہ باہر نکل رہی تھی اسی سے وہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ دونوں کی نظریں اچانک ملیں تو ایک درد آنکھوں کے راستے ان کے اندر دھوپ کی طرح پھیل گیا۔ چند لمحوں کے لئے تو دونوں ہی سکتے میں آ گئے۔ پھر پہل سارہ نے ہی کی۔ مغربی ممالک میں لمبے قیام نے اس میں کم از کم مرد سے بات کرنے کا حوصلہ بڑھا دیا تھا۔

"کیسے ہو؟" اسے اپنا لہجہ نہ جانے کیوں اجنبی سا لگا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم کہو۔ کب واپس آئیں"؟ راشد نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔

"ابھی۔ اسی فلائٹ سے" وہ خاموش ہو گئی۔

سامان کلیئرنس کا منتظر تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا اٹیچی کیس اور بازو میں بڑا سا پرس جھول رہا تھا۔ راشد کو دیکھتے ہی اس نے اٹیچی کیس زمین پر رکھ دیا تھا۔

"بیٹھو گی ذرا......" راشد نے کچھ ایسے ملتجی لہجے میں کہا کہ وہ کٹ کر رہ گئی۔

جواب میں اس نے صرف نظر بھر کر اسے دیکھا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کی

ساری خود سری، خود اعتمادی دھری کی دھری رہ گئی۔ راشد اٹیچی کیس اٹھا کر آگے بڑھ گیا اور وہ سحر زدہ سی اس کے تعاقب میں چلنے لگی۔ سات سال میں راشد کی چال میں سوائے اس کے اور کوئی فرق نہیں آیا تھا کہ اس کے کندھے آگے کی طرف جھک گئے تھے۔ وہ قدرے فربہ بھی تو ہو گیا تھا اور بالوں میں بھی کچھ چاندی چمکنے لگی تھی۔ مسکراہٹ البتہ ویسی ہی طنز آمیز تھی۔ آواز بھی اسی طرح پاٹ دار اور آنکھوں کا تجسس تو پہلے سے دوچند ہو گیا تھا۔

کینٹین میں بیٹھے وہ کافی سامنے رکھے صرف یہی سوچتے رہے کہ انہیں بچھڑے واقعی سات سال ہو گئے ہیں۔ "میں آنٹی سے تمہارے متعلق پوچھتا رہتا تھا۔ مجھے علم تھا تم واپس آ رہی ہو۔" نہ جانے راشد نے کیوں اس سے یہ بات کہہ دی۔

"اچھا تو ہار مان لی ہے اس نے۔ بڑا مرد بنا پھرتا تھا۔ اونہہ۔" سارہ نے سوچا وہ کہنا تو کچھ اور چاہتی تھی لیکن اس کی طرح نہ چاہتے ہوئے بھی کہہ گئی۔ "ہاں تھک گئی ہوں ناں۔"

اسے یوں لگا جیسے اس نے کافی کے بجائے کھولتے ہوئے تیزاب کا گھونٹ بھر لیا ہو۔ "تم تھک بھی سکتی ہو۔ ناممکن تم جیسی خود سر لڑکیاں کبھی نہیں تھکا کرتیں وہ تو اپنے ہم سفروں کو بھگا بھگا کر مار ڈالتی ہیں۔ نو سارہ۔ نو" اس نے سوچا اب وہ کیا کہے سارہ سے۔ کوئی ایسا ذومعنی سا فقرہ جو اس کی الجھن، اس کی خلش کا مداوا کر دے۔ لیکن کیا؟ حرفوں کی جھولیاں تو خالی ہو رہی تھیں۔ "مسٹر راشد تم نے آج تک پروفیسری نہیں کی جھک ماری ہے جھک۔ ہاں! اور کیا؟ کہاں گئی تمہاری لفاظی۔ کاٹ دار فقرے۔ بس!" بالآخر وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ "ملک ملک گھومی ہو گی۔" اور کیا کہتا۔

"اور کیا کرتی؟ کڑھتے کڑھتے مر جاتی۔ تمہارے سامنے ہتھیار ڈال کر خودکشی کر لیتی۔ تم نے تو یہی سوچا ہو گا۔ تم سارے مرد اسی طرح سوچتے ہو۔ سب ایک ہی تھیلی

کے چٹے بٹے ہو۔ دیکھو! دیکھو مجھے، میں اسی طمطراق سے زندہ ہوں۔ ویسی ہی ہوں۔ تمہاری طرح میرے کندھے نہیں جھکے میرے بالوں میں اب بھی سمندر کے رنگ جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ میں ہاری نہیں! میں ہارنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئی۔"

سارہ کا جی تو چاہتا تھا چیخ چیخ کر راشد سے سب کچھ کہہ دے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ کسی نادیدہ طاقت نے اس کی قوت گویائی سلب کرلی تھی۔

"بس کچھ زیادہ نہیں، تم کہو؟" اس نے چمچ پلیٹ کے کونے پر بجاتے ہوئے کہا۔

"میں میں تو وہی پڑھا رہا ہوں۔ میرے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ تمہاری طرح سیاست کر سکتا۔"

"ہاں ہاں! اور کہو ایسی باتیں۔ اپنی بے بسی کا اسی طرح اظہار کرتے رہو۔ خود کو دنیا کی مظلوم ترین مخلوق ثابت کرو۔ کہہ دو امیر باپ کی بیٹی نے مجھ پر ظلم کیا۔ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر بھاگ گئی۔" سارہ نے سوچا مگر اس کے لبوں پر الفاظ اترے۔ "مجھے اب چلنا چاہئے۔"

پھر اس نے گھڑی پر نظریں دوڑائیں وہ اگر چند منٹ بھی اور وہاں رہتی تو دم گھٹنے سے مر جاتی۔

بیرا انہیں اٹھتے دیکھ کر قریب آگیا۔ سارہ کا ہاتھ بے اختیار پرس کی طرف بڑھا۔ لیکن اسی لمحے نہ جانے اسے راشد کی آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ بل راشد نے دیا۔ دونوں اکٹھے ہی باہر آئے تھے۔ ٹیکسی تک وہ اسے چھوڑنے آیا۔ راستے میں انہوں نے ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہا تھا۔ بس دونوں ہی مسمریزم کے کسی "معمول" کی طرح ٹیکسی اسٹینڈ تک چلے آئے تھے۔!!

"ہم آئندہ مل سکیں گے یا۔" یہ فقرہ سو فیصد غیر اختیاری طور پر سارہ کے منہ سے نکلا تھا۔ اس کا جی چاہا اپنا منہ آپ ہی نوچ لے۔

"کل سالوس" میں دوپہر کو چلی آنا۔ کھانا وہیں کھائیں گے۔ راشد نے کسی مشینی عمل کی طرح جواب میں کہا۔

ٹیکسی سارہ کو لے کر آگے بڑھی تو دونوں کی آنکھیں یوں چھلکیں جیسے پانی کا تیز دھار چٹان کے سینے سے اچانک پھوٹ پڑے۔

ساحل سمندر پر اس چھوٹے سے ریستوران میں وہ سات سال بعد آیا تھا۔ پہلی دفعہ بھی سارہ کے ساتھ آخری مرتبہ بھی اس کے ہمراہ اور آج پھر ایک کونے میں رکھی میز پر کہنیاں ٹکائے سر ہاتھوں کے پیالے میں رکھے وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں کیوں آیا ہے؟ جبھی وہ اس کی میز کے کنارے آکر ٹھہر گئی۔

"ہیلو۔"

"سارہ۔"

اور دونوں ایک دوسرے کے سامنے مجرموں کی طرح سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ بیرے نے تلی ہوئی مچھلی ان کے سامنے رکھ دی تھی۔ یہ واحد چیز تھی جس پر دونوں نے پچھلی زندگی میں اتفاق کیا تھا۔ نہ جانے سارہ کو مچھلی منگوانے پر کیوں افسوس سا ہوا۔ وہ چاہتی تھی راشد کوئی اپنی پسند کی چیز منگوائے۔ پلیٹ میں رکھی مچھلی کو چھیڑتے ہوئے وہ کبھی کبھی غور سے راشد کے سر میں چمکتی چاندی کو دیکھنے لگتی۔ اس کے ذہن میں ماضی کی یادیں ہلکورے لینے لگی تھیں۔ ایک مدت کے فراموش ہیولے دوبارہ جی اٹھے تھے۔

حسین اضطراب، دھڑکتا دل، جھنجھناتا بدن پہاڑیوں پر گہرے سرخ رنگ کے گلاب، اولین بارش سے دھوپ کی ماری بھیگی زمین کی سوندھی خوشبو، کمپنی باغ کی سڑک پر دورویہ لگے یوکلپٹس کے سایہ دار درختوں تلے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ان کی چہل قدمی۔ پام کے بلند درختوں کے درمیان سرسراتی ہوائیں، سمندر کا کنارہ، ریت اور ادھ ننگے جسم، آگ گلتا سورج، آتش بداماں تپتے بدن اور دہکتی روحیں۔

پھر -!!

شادی، رنگین تصویریں اور سلائڈز، سرخ رنگ کا عروسی جوڑا، زیورات سے لدی پھندی دلہن شہنائیوں کی آوازیں سہیلیوں کی چہلیں، قہقہے، مبارکبادیاں، فیملی فوٹو۔ کیمرے نے مسکراہٹوں اور وقت کو منجمد ہی تو کر دیا تھا۔ خضاب لگی داڑھی اور سرمے بھری آنکھوں والے ایک مولوی صاحب دو گواہوں کے ساتھ اس کے کمرے میں اس کی سہیلیوں کے درمیان چلے آئے اور اس کے سر ہلانے پر اس کی محبت نے ایک ضابطے کی شکل اختیار کرلی۔ کاغذوں کے ایک پلندے پر مختلف جگہ پر دستخط کر کے ایک عہد میں بندھ گئی بڑی گرم جوشی سے اپنے عہد پر قائم رہی۔

"تم بالکل نہیں بدلیں سارہ" راشد سناٹے سے اکتا گیا اور میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سارہ نے سوچا۔ یہ وہ راشد تو نہیں ہے جو اس کے ماضی کی بھلیوں سے بار بار سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے عقب میں سمندر کی جھاگ اڑاتی متلاطم لہریں تھیں۔ اس کی زندگی کے سات سال تھے وہ ایک اور ہی دنیا تھی۔ کوئی دوسری دنیا کا دوسرا دور۔ وہ سات سال ایک عہد کی طرح تھے۔ "پروفیسر صاحب! انسان، اسکول اور کالج ہی سے نہیں شادی سے بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔" وہ مسکرادی لیکن اس کی مسکراہٹ میں بھی سراسیمگی کی ایک کیفیت تھی۔ "تم اس مرد سے کیا بات کروگی۔ سارہ بی بی جس کے ساتھ تم نے زندگی کے دو بھرپور سال گزارے ہیں اور جو آج سات سال بعد پھر اچانک ایک موڑ پر پہلے کی طرح تم سے ٹکرا گیا ہے۔ یہ شخص تو حادثے جنم دینے آیا ہے۔ کچھ کہنے کے لئے اب رہا ہی کیا ہے۔"

دونوں اب کھلی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے، پوری آگہی کے ساتھ لیکن سارہ کی سوئی محبت نے کروٹ نہ بدلی۔ جو درد اس کے اندر جاگ رہا تھا

وہ محبت تو نہیں تھی شاید یادوں کا طوفان اس کی قوت فیصلہ پر اثر انداز نہ ہوا۔ وہ حیران سی گزرے وقت کے دریچوں سے اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں جھانکتی رہی، اسے اپنی اولین محبت کا سپنا یاد آگیا۔ وہ معصومیت، وہ سادہ لوحی، وہ اناڑی پن، یو کلپٹیس کا جھنڈ اور چیختی چلاتی ہواؤں کی سرسراہٹ اس کے اندر جاگنے لگی۔ کیا میں اسے بتا دوں کہ میری حقیقی زندگی تو طلاق کے بعد سے شروع ہوئی تھی اور تم ہی کہا کرتے تھے راشد تم جو ادب کے طالب علم بھی ہو اور استاد بھی کہ انیسویں صدی کے ناولوں کا اختتام شادی پر ہوتا تھا اور بیسویں صدی کے ناولوں کی ابتدا طلاق سے ہوتی ہے۔ اس کی زندگی دو حصوں میں منقسم تھی ایک طلاق سے پہلے کا دور۔ دوسری جنگ عظیم نے جو کچھ دنیا کو دیا تھا وہی کچھ اس کی شادی کے انفساخ نے اسے دیا۔ اس نے اسے توڑ پھوڑ ہی تو ڈالا تھا۔ اس کے بخئے ادھڑ گئے تھے۔ وہ پامال اور شکستہ کھنڈروں جیسی روح کے ساتھ زندگی کے موہنجوداڑو میں اندھی چمگادڑوں کی طرح بھٹکتی پھری تھی۔ زخموں سے چور اس کے اندر کی ہر چیز مر گئی تھی۔ اسے اپنی ذات کی تخلیق کا عمل بالکل نئے سرے سے شروع کرنا پڑا تھا۔ اس نے اپنے پیکر میں خود سے دوبارہ جنم لیا تھا۔

دونوں سمندر کی شوریدہ سر موجوں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان کے تصور میں سہانی یادوں کے سائے گڑے مردوں کی طرح سر اٹھا رہے تھے۔ یادیں ذہنوں کے ترازو میں تلنے لگیں۔ مثبت و منفی۔ دکھ سکھ، زحمت رحمت، ان کے عقب میں تاحد نظر پھیلا نیلگوں پانی ماضی کی گم شدہ تہذیبوں کا رونا رو رہا تھا۔ اس کا گیت ابدی تھا۔

عالم تصور میں وہ دونوں۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سامنے والی پہاڑی پر دوڑتے ہوئے چڑھنے اترنے لگے۔ پھر عالم وحشت میں ایک دوسرے سے لپٹ کر ہمیشہ ایک ہی ڈوری میں بندھے رہنے کا اقرار کرنے لگے۔ اس کے سابقہ خاوند نے اپنے سانولے ہاتھ سے اس کے لئے کافی بنائی۔ وہی ہاتھ جو اچانک سات سال بعد دست سکندری کی

طرح نمودار ہو کر اس کے سامنے آیا تھا۔ اس کے نیم مردہ ہاتھ کو دبانے لگا۔ سارہ کی دہکتی آنکھوں میں ایک شعلہ سا روشن ہو گیا۔ وہ سوچنے لگی کیا یہ کھیل اب پھر نئے سرے سے شروع ہونے والا ہے؟ اف میرے خدا! وہ سب کچھ بھی تو اسی طرح اچانک شروع ہو کر اچانک ختم ہو گیا تھا وہ رات کتنے کرب ساتھ لائی تھی۔

آدھی رات کے بعد جب وہ گھر آیا تو آرام دہ صوفے میں دھنس کر اس کے گرد سگریٹ کے مرغولے اڑانے لگا تھا وہ اس سے بہت کچھ کہنا سننا چاہتی تھی لیکن راشد تو پتھر بنا صوفے میں دھنسا رہا وہ روہانسی ہو کر جانے کیا کیا بول گئی تھی۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ پھر اچانک اس کی ہچکیوں کو بریک لگ گئی۔

"میں طلاق چاہتا ہوں۔ مجھے کسی اور شے سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھے شادی کی پہلی رات ہی احساس ہو گیا تھا کہ ہم نے زبردست غلطی کی ہے۔" پتھر کی چٹان زہر اگلتی رہی۔

سارہ کے دماغ میں زوردار دھماکہ ہوا۔ سوائے سننے کی حس کے باقی تمام حسیات کو موت آ گئی۔ راشد کی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دے رہی تھی وہ سامان تقسیم کر رہا تھا۔ جانے کیا کیا بولتا رہا اور سارہ گرداب میں پھنسی زور زور سے چکر کاٹتی رہی پھر وہ اس بھنور میں ڈوبتی چلی گئی۔

وہ چھوٹا سا فلیٹ جس پر کبھی دونوں فخر کیا کرتے تھے، سارہ کے لئے قبرستان بن گیا تھا اس میں موجود ہر شے اپنی قدر و قیمت اپنا حسن کھو چکی تھی، جب وہ زور سے دروازہ بند کر کے دھڑ دھڑ کرتا نیچے چلا گیا تو گویا سارا ماحول مسخ ہو کر رہ گیا۔ کمرے کا شاندار فرنیچر لکڑی کا بے جان ڈھیر بنا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

وہ شادی کے کاغذی پلندے کو جس پر نہ جانے کتنی جگہ مولوی صاحب نے دستخط کرائے تھے ردی بنا کر چلا گیا۔ اس کا رشتہ اسے چھوڑ گیا۔ بھلے کچھ بھی تھا وہ تھی تو ایک کمزور عورت۔ تنہا غیر وابستہ اور آزاد ہونے سے وہ ڈرتی تھی۔ آزادی۔ اس نے تو کبھی

اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ درد کی شدت سے اندھی ہو کر وہ اپنی روح کے صحرا میں رینگتی اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرتی رہی۔

بیرا ان دونوں کے بیچ ایک مشروب کا جگ رکھ گیا تھا۔ آخری پہر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اب دن بھر کی گرمی کو اپنے اندر سمیٹ کر آگے کی سمت بھاگ رہے تھے۔ سارہ کے وجود میں دو عورتیں جنگ آزما تھیں۔ ایک وہ عورت جو وہ تھی اور ایک وہ جو وہ ہونا چاہتی تھی۔ راشد نے مشروب گلاس میں انڈیل کر اس کے آگے سرکا دیا۔ سمندر کے کنارے سرسرانے والی ہوا غیر متوقع طور پر تھم گئی تو جانے سارا کو کیوں ایک گھمبیر سے سکون کا احساس ہوا۔ وہ ایک شیریں سی نقاہت محسوس کرنے لگی۔ کیا میں خشکی پر پہنچ گئی ہوں؟ اس نے خود سے سوال کیا۔ کوئی ملک؟ کوئی خود مختار ریاست؟ ہاں۔ ہاں، یہ اس کی اپنی ریاست ہی تو تھی لیکن کوری دھرتی تھی یہ اسے سب کچھ ابتداء سے تعمیر کرنا تھا۔ اس کی سرحدیں وضع کرنی تھیں۔ اس کی زبان اس کا آئین۔ ایسا قانون جو سراسر اس کا اپنا ہو اسے اپنے اوپر خود ہی "ٹن کمانڈمنٹ" کا نزول کرنا تھا اپنا جغرافیہ خود ہی متعین کرنا تھا۔

ریستوران آہستہ آہستہ خالی ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے معذرت خواہانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ کبھی کبھی جب کہنے کو کچھ نہ ہوتا تو وہ خالی خالی نگاہوں سے اس سمت آنے والی سڑک کو گھورنے لگتے۔ ان کی نگاہوں میں ناکامی کی پرچھائیاں ہلکورے لے رہی تھیں۔ ہاں! وہ ایک دوسرے کے لئے ناکام ہی تو رہے تھے۔ محبت کے عہد پر قائم جو نہ رہ سکے تھے۔

"میں اس کھیل میں کبھی کامیاب نہیں رہا سارہ!" وہ الجھے الجھے لہجے میں سارہ سے کہنے لگا جب وہ شادی شدہ تھے تو اپنے مسائل زندگی کے متعلق ایک لفظ زبان پر لانے کی جرأت نہ پاتے تھے۔ مگر اب وہ بالکل غیر متوقع طور پر اپنی ناکامی کی باتیں کر رہا تھا۔

اپنی مایوسی کا رونا رو رہا تھا اسے اپنی ناکامی پر واقعی دکھ تھا کہ وہ سارہ اور خود کو کیوں خوش نہ رکھ سکا۔ اس کی اور اپنی محبت کے اپنے ہاتھوں تعمیر کردہ تاج محل کو خود ہی مسمار کر کے کیوں چل دیا؟ اور یہ احساس وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتا ہی تو جا رہا تھا۔

سارہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتی رہی۔ اسے یوں لگا جیسے راشد اب پہلے سے بھی کچھ زیادہ بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن اسے اب الجھن بھی ہونے لگی تھی کہ آخر وہ اس کا لگتا کیا ہے؟ وہ اس کے متعلق کیوں سوچ رہی ہے؟ اس کی نظریں راشد کے چہرے سے پھسل کر اس کے کھلے گریبان میں جھانکنے لگیں جہاں سفید بالوں کے کئی گچھے نمایاں تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے ماضی کو چیلنج کرے اپنے سابقہ شوہر اور محبوب کے ناکام روابط کو فتح مندی اور کامیابی کی منزل سے ہمکنار کر دے۔ لیکن کیوں؟ وہ ایسا کیوں کرے؟ آخر یہ ادھیڑ عمر پروفیسر اب اس کا کیا لگتا ہے۔ اسے اخلاق و مذہب کی کون سی شق نے ایسا سوچنے کا حق دیا ہے؟

ان کے عقب میں اب آسمان اور سمندر دونوں کا رنگ نیلا ہونے لگا تھا۔ دونوں گھبرا کر وہاں سے اٹھ آئے اور آہستہ آہستہ ساحل بحر کی طرف بڑھنے لگے تب سارہ نے محسوس کیا جیسے وہ روانہ ہونے والے بحری جہاز کے عرشے پر غروب ہوتے ہوئے سورج کے آتشیں پس منظر میں تنہا کھڑی ہے۔ وہ ہاتھ ...... ہلا ہلا کر اپنے پیاروں، اپنے دیس اور اپنے پسپا ہوتے ہوئے ماضی کو الوداع کہہ رہی ہے تب اس نے وہیں عرشے پر کھڑے کھڑے عہد کیا تھا کہ وہ اپنے خوابوں کے قد کاٹھ کے مطابق زندگی بسر کرے گی۔ ایک سفری تھیلے اور سلیپنگ بیگ کے ساتھ وہ اپنے سفر پر چل پڑی تھی۔

لندن، پیرس، ڈبلن، اسٹاک ہالم۔ اوسلو، کوپن ہیگن، ایمسٹرڈم، برلن، نیویارک اور جانے کہاں کہاں بس، ٹرین، ہوائی جہاز، کشتی ہر ذریعہ سفر اس نے اپنایا۔ فاصلے اس کے لئے بے معنی ہو گئے۔ دنیا نے سکڑ کر ایک گاؤں کی شکل اختیار کر لی۔ سرحدیں،

زبانیں، ثقافتیں سب اس کے لئے معدوم ہو گئیں۔ سڑکیں اس طرح گھومتی اور سفر کرتی تھیں جیسے اس کے جسم میں رگیں اور ان میں گردش کرتا خون جیسے آسمان پر سورج کا سفر۔

پھر وہ ایک ایسی نوجوان عورت تھی جس کی ہر حرکت کی زندگی سے ہم آہنگ تھی۔ وہ ساری قیود سے آزاد تھی۔ مختصر نوٹس پر کسی بھی لمحے ہجرت کرنے کو تیار، چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے اس نے اپنی آزادی کا سودا کبھی نہ کیا۔ اس نے انتہائی حیرت سے نظارہ کیا۔ کہ خود زندگی نے اسے متحرک کر رکھا ہے۔ اس پانی کی طرح جو تیراک کو سنبھالے رکھتا ہے اور انجان کو ڈبو دیتا ہے۔

اس نے ابھی تک خود کو کسی معاہدے کا پابند کرنے سے گریز کیا تھا لیکن وہ اپنی فطرت سے بغاوت نہ کر سکی اور ایک مرتبہ پھر زندگی نے اسے جکڑ دیا۔ اس مرتبہ جس آدمی سے اس کا واسطہ پڑا تھا اس کا نام راشد نہیں تھا لیکن اسے تین ماہ بعد ہی علم ہو گیا کہ تھوڑے فرق سے سب مرد راشد ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ اس نے دوسرے راشد کو پہل نہ کرنے دی اور خود بڑھ کر نجات پالی۔

پھر وہ اپنی لمبی یاترا سے اچانک لوٹ آئی اس کا بن باس مکمل ہو گیا تھا۔

"سارہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر نامکمل تھے۔ ہیں اور رہیں گے۔ زندگی نے ہم سے بہت کچھ لے کر ہمیں کچھ دیا بھی ہے۔ ہمیں شعور اور پہچان دے دی ہے۔ آؤ ہم پھر اپنے ماضی کو حال میں ڈھال لیں۔ ہمیں اب بخوبی علم ہو گیا ہے کہ ہم نے ٹھوکر کہاں کھائی تھی۔ کہاں سنبھل کر چلنا ہو گا۔ آؤ سارہ۔ تم کس سوچ میں پڑ گئیں۔ صبح کے بھولے شام کو لوٹ آتے ہیں سارہ۔"

سارہ کا دل ایک لمحے کو پگھلا اور وہ خود کو کرۂ ارض پر محبت کی وینس سمجھنے لگی۔ اس نے سوچا وہ محبت کی ایسی دیوی ہے جو زمین میں دور تک جڑیں چھوڑتی ہے تا کہ بانجھ اور

بنجر زمین زرخیز اور سرسبز شاداب ہو سکے۔ دھرتی، سورج، پتھر، چٹانیں سب اسے اپنے وجود کا حصہ محسوس ہونے لگے۔ اس کی ذات میں ساری کائنات سما گئی۔

لیکن وہ لمحہ تیزی سے گزر گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آیا تھا۔

تب اس نے بڑے پروقار انداز میں اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور بولی۔ "نہیں راشد جو لوگ شام ڈھلنے کے بعد گھروں کو لوٹتے ہیں ان کی پہچان کھو جاتی ہے۔ وہ بے نام ہو جاتے ہیں۔ تمہاری اور میری طرح۔ ہمارا ماضی اب کبھی حال نہیں بن سکتا۔"

راشد کو یوں محسوس ہوا جیسے کھلے سمندر کے لہردار پانیوں کی ساری کڑواہٹ اس کے اندر اتر گئی ہے۔ وہ نڈھال سا لوہے کے جنگلے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا اور سارہ ریت پر اپنے پیروں کے نشان چھوڑتی اس سمت بڑھ گئی جہاں دو سڑکیں ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزر رہی تھیں۔

سدا سہاگن

گوہر جان حوالدار نے چلتے چلتے پلٹ کر دیکھا، چاچا علم دین اور صغراں خاصے پیچھے رہ گئے تھے وہ رک کر ان کا منتظر ہو رہا۔

"بیٹی بشیر کو مجھے پکڑا دے تو تھک جائے گی--" وہ اپنی بہو سے مخاطب ہوا۔

"نہیں چاچا! میں اسے وہاں تک خود لے کر جاؤں گی۔" اس کا لہجہ گھمبیر اور پرسکون تھا۔ ایسا ہی جیسا خاموش پانیوں کے نیچے چکراتے طوفان کا لہجہ۔

چاچا خاموش ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز جیسے اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ بڑی عجیب سی خواہش تھی صغراں کی چھوٹے سے اسٹیشن پر اتر کر تانگے پر بیٹھ کر وہ یہاں تک آئے تھے۔ اس سے آگے راستہ کچا تھا اور انہیں پیدل چل کر جانا تھا۔ چاچا علم دین اور گوہر جان حوالدار دونوں نے ننھے بشیر کو گود میں اٹھانے کی خواہش ظاہر کی، انہیں علم تھا کہ صغراں پچھلے ایک ہفتے سے بیمار ہے لیکن گھر سے یہاں تک اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی بشیر کو خود سے جدا نہ کیا۔

"پاگل ہے" چاچا علم دین نے اپنے گلے میں پھنسے کرب کا گلا گھونٹتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ صغراں یا گوہر جان کے سامنے کسی بزدلی کا مظاہرہ کرے۔ پچھلے دو تین برسوں سے وہ گاؤں والوں سے چھپ چھپ کر بہت رو چکا تھا اور

اب تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے ہوں گے، لیکن اب جو اچانک یہ کرب اس کے اندر سے پھوٹا تو اسے یہی گمان گزرا کہ اس کے وجود میں خون کی بجائے آنسوؤں کا سمندر لہریں مار رہا ہے۔

ان کے قریب آنے پر گوہر جان نے قدم آگے بڑھانا چاہا تو جیسے چاچا ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"کیا نام بتایا تھا تو نے بچہ اس جگہ کا؟"

"جاکے۔ چاچا! جاکے۔" گوہر جان نے اس کی طرف مڑے بغیر جواب دیا۔

"جاکے" کا نام سنتے ہی چاچا علم دین کو جیسے ایک دم سے ساری کہانی یاد آ گئی۔ وہ کہانی جسے بھلانے کیلئے اس نے بیس سال کا سنیاس بھگتا تھا بیس سال تک اس نے جس درد کو اندر ہی اندر دبائے رکھا تھا، وہ زہر باد بن کر اس کی شریانوں میں پھوٹ پڑا۔ گاؤں کا نام جان کر علم دین کو یوں لگا جیسے وہ اپنے اندر ہونے والے زوردار دھماکے سے پھٹ کر فضا میں بکھر گیا ہو۔

سرحد یہاں سے بمشکل تین چار میل دور رہی ہو گی۔ اسکے لاشعور سے زینب زندہ پیر کی طرح انگڑائی لے کر جاگ اٹھی۔ بٹالے سے وہ اپنے دو بیل، ایک گڈا، غلام محمد اور زینب کو لے کر بمشکل ہی قافلے میں شامل ہو پایا تھا۔ باقی سارا اثاثہ تو پہلے ہی لٹ چکا تھا۔ پھر اس کا زینب اور غلام محمد کے سوا اور تھا بھی کیا۔ ساری برادری کی مخالفت مول لے کر اس نے زینب کو اپنایا تھا۔ کس کس نے اسے منع نہیں کیا تھا۔ علم دین میں کیا کمی تھی؟ گھر بار، ڈھور ڈنگر، اپنی زمین۔ کیا نہیں تھا اس کے پاس، پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ "برادری" والا تھا۔ ارد گرد کے دس پندرہ دیہاتوں میں تو اس کی برادری کے لوگوں کی چودھراہٹ تھی لیکن تھا راجپوت کا بچہ۔ بس ایک مرتبہ جب زینب سے کھڑی مالی کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گا تو زینب سے ورنہ ساری عمر یونہی گزار

دے گا تو پھر ڈر کا ہے کا۔

اور ایک روز ہر چوال کے راجپوت جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جب ان کے لڑکے نے ماچھیوں کی لڑکی سے نکاح کر لیا۔ چوہدری اللہ وسایا نے پہلے تو طیش میں آ کر بھری پنچایت میں اسے عاق کر دیا۔ لیکن ٹوٹی بانہیں گلے کو ہی آتی ہیں۔ جب اسے علم ہوا کہ اس کا گھبرو پتر سر پر ٹوکری رکھ کر منڈی میں پلے داری کرنے لگا ہے تو جیسے وہ تڑخ کر رہ گیا۔ راجپوتی آن بان کی فلک بوس عمارت دھڑام سے زمین پر آ رہی اور ہر چوال کے باسی انگشت بدنداں رہ گئے جب انہوں نے ایک روز اپنے نمبردار چوہدری اللہ وسایا کو ماچھیوں کے گھروں میں جاتے دیکھا۔

"چل اٹھ پتری اپنے گھر چل۔" اس نے زینب کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ دیا۔ غلام محمد تب بمشکل تین چار ماہ کا ہوا تھا۔

"میرے ایسے بھاگ کہاں تھے۔ یہ تو بس میرے غلام محمد کی وجہ سے مجھے یہ مان ملا۔" اس نے چوہدری اللہ وسایا کے گھر پہنچتے ہی خوشی سے بے قابو ہو کر علم دین سے کہا۔

"بڑے نصیبوں والا ہے میرا لال۔" علم دین نے بڑھ کر غلام محمد کو گود میں بھر لیا۔

کرنے کو تو چوہدری اللہ وسایا اپنی سی کر گزرا۔ لیکن برادری نے اس کے فیصلے کو بادل نخواستہ ہی قبول کیا تھا۔

بٹوارہ ہوا تو غلام محمد بمشکل ڈیڑھ دو برس کا ہو گا۔ ان کے گاؤں پر جیسے سارے بٹالے کے سکھوں نے مل کر حملہ کر دیا تھا۔ کیونکہ ارد گرد کے دیہاتوں سے بھاگ بھاگ کر مسلمان انہی کے ہاں پناہ لے رہے تھے۔ راجپوت بھی کسی مائی کے جنے تھے۔ بلوائی تب ان کے گھروں تک پہنچ پائے جب ایک ایک کر کے سارے کٹ گئے، جو بچے وہ نہتے تھے یا زخمی۔ کیا مجال جو جیتے جی انہوں نے کسی کو اپنے گاؤں کی "جوہ" (حدود) میں پھٹکنے دیا ہو۔

کیا کیا عذاب نہیں بھگتا تھا علم دین اور دوسرے قافلے والوں نے یہاں تک پہنچنے کے لئے۔ ابھی وہ سرحد سے بمشکل دس بارہ میل دور تھے۔ جب اچانک ایک منظم بلوائیوں کا گروہ ان پر آن پڑا۔ علم دین نے بیلوں کو بھگانا چاہا لیکن بھوکے پیاسے جانور کہاں تک حق نمک ادا کرتے۔ ایک کرپان سے مسلح بلوائی اس کے گڈے پر بھی چڑھ آیا اس نے کرپان لہرا کر پہلا وار ہی زینب کی آغوش میں دبکے غلام محمد پر کیا تھا۔ زینب نے تڑپ کر بچے کو اپنے نیچے دبا لیا بالکل اسی طرح جیسے کوئی مرغی کسی گدھ کو دیکھ کر اپنے بچوں کو پروں کے نیچے پناہ دیتی ہے لیکن کرپان اپنا کام کر چکی تھی زینب کی گردن ایک طرف سے کٹ کر دوسرے کندھے سے آن لگی۔ علم دین جو بدستور بیلوں کو بھگانے میں مصروف تھا تب چونکا جب وہ لٹ چکا تھا۔ زینب کی چیخ نے اس کے تن مردہ میں بجلیاں دوڑا دیں اس نے اپنے دائیں ہاتھ رکھی کلہاڑی تھامی وحشیوں کی مانند بلوائی پر پل پڑا اور اسے کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر وہ دیوانہ وار زینب کی طرف پلٹا۔

"زینے! زینے!" اس نے زینب کی گردن اپنے زانو پر رکھ کر اسے جھنجھوڑا۔ غلام محمد کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ علم دین کو یہ خوف لاحق ہوا کہ کہیں دہشت سے اس کا بچہ مر ہی نہ جائے اس نے دوسرے ہاتھ سے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ بیل اپنے مالک کا حق نمک ادا کرنے پر تل گئے تھے وہ جان توڑ کر بھاگ رہے تھے۔

"علمے! رب راکھا...... میرے...... بچے کا خیال...... رکھنا...... میرے کرموں میں اپنا...... ملک دیکھنا نہیں لکھا......" زینے نے آخری ہچکیاں لیں۔

"ہوش کر زینے! ہوش کر! پاکستان آنے والا ہے۔ زینے، نہیں! نہیں! اوہ میرے مولا--

علم دین نے زینب کی ڈھلکی گردن دیکھ کر سسکاری بھری۔

اس نے غلام محمد پر تکی زینب کی آنکھوں کے پپوٹے بند کر دیئے اور اسی طرح

نڈھال سا بیٹھا رہا، اسے نہ غلام محمد کے رونے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ نہ ہی قافلے والوں کی چیخم دھاڑ۔ وہاں تو بس وہ تھا اور اس کی زینے۔ پاکستان کب آیا؟ اور مسلم لیگی ورکروں نے کب اسے زینے سے الگ کیا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ وہ تو جیسے خواب میں چل رہا تھا۔

مہاجر کیمپ میں غلام محمد اس کے سینے سے چمٹا رہتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھا چپ چاپ فضاؤں میں بکھری اپنی زینب کی یادیں سمیٹتا رہتا۔ کارکنوں نے ہی اس کی تدفین کی تھی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب علم دین کو ایک دوسرے ضلع میں تھوڑی سی زمین اور مکان الاٹ کر دیا گیا۔

پانچ سال کا عرصہ کوئی معمولی نہیں ہوتا۔ ہر سال دبے پاؤں آتا اور اس کے فگار کلیجے پر قدم رکھتا آگے کو سرک جاتا۔ علم دین باقاعدگی سے ہر سال "جاکے" جایا کرتا۔ یہی تو تھا وہ "جاکے" جہاں اس کی زینے دفن تھی۔

بڑا سیلاب آیا تو قبرستان بھی بہہ گیا اور یہ سہارا بھی ختم ہو گیا۔ سارے خاندان نے اس اثناء میں اسے مجبور کیا کہ وہ دوسرا بیاہ کر لے لیکن وہ بھی ایک راجپوتنی کا جنا تھا کہ زینب کو دیا قول کبھی نہ بھلایا اس نے زینب سے کہا تھا۔ "اگر اس کی شادی ہو گی تو زینب سے ورنہ نہیں"--!

کہہ کہہ کر خاندان والے بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔ علم دین نے زینب کی امانت میں خیانت نہ کی غلام محمد پر بھی جوانی امڈ امڈ کر آئی۔ جس راہ سے گزرتا گاؤں بھر کی کنواریاں آنکھیں بچھاتیں۔

ایک روز سننے والوں نے سنا کہ غلام محمد بھرتی کرنے والوں کی ٹیم کو انٹرویو دینے جا رہا ہے۔ اس وقت علم دین کو یوں لگا جیسے کسی نے ہاتھ بھر کر اس کا کلیجہ باہر نکال لیا ہو۔ کون تھا اس کا؟ تب زینب نے اس کے دل کے بند کواڑوں پر دستک اور اسے مبارک باد

دی کہ اس نے زینبے کی امانت کی لاج نبھائی ہے۔ جس روز غلام محمد پہلی بار گاؤں چھٹی آیا اور علم دین کے سینے سے لگا تو اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ غلام محمد نے آج پہلی مرتبہ باپ کو روتے دیکھا تھا، لیکن اسے کون بتاتا کہ علم دین کب نہیں رویا تھا یہ الگ بات کہ سب سے الگ تھلگ اس نے اپنے غم کو غمِ ذات ہی بنایا سب سے اپنا روگ چھپا رکھا تھا!

"اباجی" اس نے حیرانگی سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں پتر آج تجھے وردی میں دیکھا تو خوشی سے آنسو نکل آئے۔ تیری ماں جیوندی ہوتی تو کتنی خوش ہوتی۔"

سال بعد ہی اس نے غلام محمد کو بیاہ دیا اور جب اس روز وہ بیٹے کی پیدائش کے چھ سات ماہ بعد چھٹی آیا تو علم دین کے گھر دیگیں چڑھیں۔ اس نے اپنے پوتے بشیر کی خوشی اپنے پتر کی آمد پر کی تھی۔ چھٹیوں کے بمشکل پانچ روز بعد ہی نائیک غلام محمد کو بلاوا آگیا۔ بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا تھا اسے ایمرجنسی واپس بلا لیا گیا۔

گاؤں کے اسٹیشن تک وہ سب اکٹھے ہی آئے تھے پھر علم دین اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر الگ ایک کونے میں لے گیا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔

"پتر میں اس دن کا پچھلے اٹھارہ سال سے انتظار کر رہا ہوں۔ پتر ان لوگوں نے تیری ماں کو مجھ سے چھین لیا تھا۔ تب میں اکیلا تھا اور نہتا۔ میرا انتقام لینا بچہ! اپنی ماں کا بدلہ ضرور لینا۔ تو اکیلا نہیں! نہتا نہیں ہوگا تو-- بچہ یہ سب بلوائی ہیں۔ بڑے خونخوار لوگ ہیں یہ-- انہیں بتا دینا پتر کہ اب غلام محمد جوان ہو گیا ہے وہ اپنی ماں کے دودھ کی لاج نبھا سکتا ہے۔"

دور سے گاڑی کے وسل کی آواز سنائی دی تو علم دین نے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ بہو کو بھی تو ابھی کچھ کہنا سننا تھا۔

"چنگا بچہ اللہ بیلی۔ جیوندیاں دے میلے۔"

نائیک غلام محمد صغراں کے قریب پہنچا تو بشیر ہمک کر اس کی بانہوں میں آرہا۔

"صغراں وقت بڑا کم ہے۔ میں جینے کی خواہش لے کر نہیں جا رہا۔ دعا کرنا اللہ سرخروئی عطا کرے، قسمت پھر کچھ کہنے کا موقع دے نہ دے۔ میری امانت کی راکھی کرنا جس طرح میرے باپ نے میری ماں کی امانت کو سنبھالا تھا۔" وہ نجانے کیا کیا کہتا رہا...... صغراں بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔ اس کے سینے میں غلام محمد کی طرح فولاد کا دل تو تھا نہیں۔

گاڑی میں غلام محمد بیٹھا تو صغراں نے روتے روتے اس کے ہاتھ میں سرخ کڑھائی والا رومال تھما دیا۔ غلام محمد نے چند ثانیے ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھا پھر اگلی جیب میں رکھ لیا۔ گھی والے پراٹھے اور اچار ایک دوسرے دستر خوان میں بندھے اس کے قریب رکھے تھے اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر اپنے بیٹے کے گال پر بوسہ دیا اور گاڑی رینگنے لگی۔ علم دین ان دونوں سے ذرا پرے کلیجے پر سل رکھے کھڑا تھا۔ گاڑی رینگی تو وہ بے اختیار آگے بڑھا اور چلتی گاڑی سے باہر نکلے غلام محمد کے سر کو چوم لیا۔ گاؤں کے لوگ اس وقت تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتے رہے جب تک ان کا غازی مردان کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ علم دین البتہ وہیں کھڑا رہا۔ سسکیاں بھرتی صغراں اس کے سینے سے آن لگی تھی۔

جس روز غلام محمد سرخرو ہو کر لوٹا چاچا علم دین کا جلال دیدنی تھا۔ لاش فوجی ٹرک میں آئی تھی۔ اس کی یونٹ کے جوانوں نے تابوت کو پھولوں سے بھر دیا تھا۔ غلام محمد گلاب کے پھولوں میں کھلا پڑا تھا۔

"خبردار کوئی نہ رونا۔ میرے بچے نے میرا مان بڑھایا ہے۔ زینبے زینبے! دیکھ رہی ہے تو اپنے لال کو تیرے پاس آگیا ہے زینبے! مجھے اکیلا چھوڑ کر......" حوالدار گوہر جان نے چاچا علم دین کو بازو پکڑ کر وہاں سے ہٹا دیا۔

اردگرد کے سارے گاؤں اس کے لال کی "بارات" پر اُمڈ پڑے تھے۔ فلک نے ایسا جنازہ نہ کبھی دیکھا نہ ہی اس گاؤں سے پھر کوئی اس دھج سے اٹھا۔ عدت کے ایام پورے ہوئے تو صغراں کے والدین اسے لینے آئے۔

"کونسا گھر۔ میرا گھر تو یہی ہے۔" اس نے جانے سے انکار کر دیا۔

چاچا علم دین دہل اٹھا۔ "خدایا! تاریخ کیا خود کو دہرائے گی۔" اس نے ایک سال تک سارے ہی حربے آزمالئے لیکن صغراں نے کبھی خود کو بیوہ نہ جانا۔ وہ نائیک غلام محمد کی چوکھٹ سے یوں لگی کہ پھر کبھی نہ اٹھی۔ دو سال تک چاچا علم دین کی خواہش رہی کہ وہ خود اپنے بچے کی شہادت گاہ دیکھے۔ وہ ان راہوں کی دھول کو اپنی آنکھوں سے چننا چاہتا تھا جہاں اس کے جیالے شہید نے اپنے قدم رکھے تھے۔ تین سال بعد ایک روز حوالدار گوہر جان اپنا وعدہ پورا کرنے آ گیا۔

اس روز سارا گاؤں حیران رہ گیا۔ صغراں نے اپنا سہاگ کا جوڑا پہنا۔ وہ دلہن بنی جا رہی تھی۔ گاؤں والے رخصت کرنے اسٹیشن تک گئے اور وہ لوگ "جا مکے" پہنچ چکے تھے۔ علم دین کے گبھرو نے اسی مقام پر اپنی ماں کا قرض چکایا تھا۔ جہاں وہ دفن تھی۔

کھیتوں کے سلسلے کے نزدیک ایک جگہ پہنچ کر گوہر جان رک گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے یہاں ایک چھوٹی سی خانقاہ بنا رکھی تھی۔ جہاں طاقچوں میں بجھے ہوئے دیئے رکھے تھے۔ انہوں نے کئی مرتبہ یہاں سے روشنی پھوٹتے دیکھی تھی اور اب اس جگہ کو عقیدت گاہ بنالیا تھا۔

"یہ ہے وہ جگہ چاچا جہاں نائیک غلام محمد مورچہ بند تھا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اس جگہ کی نشاندہی کی۔

"اور یہاں وہ گن دشمن نے چھپا رکھی تھی۔" اس نے خانقاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"یہاں سے رینگتا رینگتا غلام محمد یہاں پہنچا۔ اس جگہ اس کے سینے میں برسٹ لگا۔

یہاں سے اس نے زقند لگائی اور گن پر گرنیڈ پھینک دیا۔" اس سے آگے گوہر جان کچھ نہ کہہ سکا اس کا گلا رندھ گیا۔

صغراں نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر اس مٹی کو بوسہ دیا۔ پھر چاچا علم دین سحر زدہ سا آگے بڑھا اور اس کی دیکھا دیکھی گاؤں کے ان لوگوں نے بھی جو وہاں اکٹھے ہو گئے تھے دعا کو ہاتھ اٹھا دیئے۔ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے پلٹ کر اس نے ننھے بشیر کی طرف دیکھا جو اپنی ماں کے قریب ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ پھر بشیر میں سے غلام محمد کی لرزتی شبیہ ابھری اور چاچا علم دین نے اپنی پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر اسے بے اختیار سینے سے چمٹا لیا۔ شام کے سائے لمبے ہونے لگے تھے اور سورج کا آتشیں گولا ریلوے لائن کے پار درختوں کے وسیع سلسلے میں ڈوب رہا تھا۔ گاؤں کے لوگ عقیدت سے آنکھیں جھکائے سدا سہاگن کے گرد دائرہ باندھے کھڑے تھے۔

جنم جلی

میرا جنم ایسے گھرانے میں ہوا جہاں صبح کی کھا کر شام کی فکر دامنگیر ہوا کرتی ہے۔

اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لئے میرے والد کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ اس ک
اندازہ کچھ میں ہی لگا سکتی ہوں۔ اکاؤنٹنٹ تھے بیچارے۔ صبح سے شام تک دفتر میں
فائلوں سے مغزماری کرتے، شام کے بعد کسی فرم میں پارٹ ٹائم کرنے چلے جاتے۔
رات کو جب وہ سائیکل پر تھیلا لٹکائے جس میں اکثر ان کے کام سے متعلق کاغذات ہو
کرتے تھے، گھر میں داخل ہوتے تو میں کٹ کر رہ جاتی۔

گھر میں سب سے بڑی اولاد میں تھی۔ میرے بعد دو بہنیں اور ایک بھائی شاید یہ
وجہ تھی کہ میں ان کے دکھ کو سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرتی۔ میرے ا
بلاشبہ مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ اور باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے بڑ
محنت سے انٹر کیا تھا۔ انٹر کے بعد شادی کر لی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، زندگی
انہیں کبھی پل بھر ستانے کا موقع نہیں دیا۔ ہم چاروں بھائی بہن بمشکل ڈیڑھ دو سا
کے وقفے سے وارد ہوئے تھے۔ میری ماں نے انہیں صرف بچے دیئے تھے۔ سکھ ک
چھایا کبھی ان پر نہ پڑنے دی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات کہا کرتی تھیں۔

"میری تو قسمت پھوٹ گئی، جانے کس منحوس گھڑی میرے والدین نے ہاں ک

دی تھی۔ کیسے کیسے رشتے آئے تھے میرے لئے، نجانے انہیں کیا نظر آ گیا تھا۔ اس موئے کلرک کے بچے میں۔"

میرے والد سر جھکائے ان کی باتیں سنتے اور صرف مسکرا کر رہ جاتے۔ باتیں کرتے کرتے وہ اپنا زاویہ نگاہ بدلتیں اور ہم سے مخاطب ہو جاتیں۔ "سارے خاندان کی ناک تھی میں۔ کیسی کیسی بدصورت لڑکیاں گلچھرے اڑا رہی ہیں اور میں...... ہائے ری قسمت؟"

ابو چپ چاپ کھڑے رہتے۔ جب امی کا غصہ عروج پر پہنچ جاتا تو دوسرے کمرے میں جا کر دفتر کی فائلوں میں گم ہو جاتے۔

بیوی اچھی مل جائے تو زندگی کے آدھے روگ اپنی موت خود ہی مر جاتے، لیکن میری ماں جیسی بیویاں خاوندوں کی زندگیوں ہی کو گھن نہیں لگاتیں۔ اولاد کی زندگیوں میں بھی زہر گھول دیتی ہیں۔ میرے لاشعور میں انہوں نے کم از کم یہ بات ضرور بٹھا دی تھی کہ غریب خاوند کے گھر جانے سے لڑکی کا مر جانا بہتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری والدہ خاندان بھر میں چندے آفتاب چندے ماہتاب تھیں، لیکن میرے والد میں کیا کمی تھی؟ خوبصورت تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ اگر زندگی نے انہیں آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا تو اس کی وجہ ان کی نالائقی نہیں بلکہ نسبی شرافت تھی جس نے انہیں ساری زندگی مکروہ ہتھکنڈے اپنانے سے باز رکھا۔

میرے والد کا جنم مذہبی گھرانے میں ہوا اور وہ والدہ کے دور پار کے رشتہ دار بھی تھے۔ ان کی خاندانی شرافت کے پیش نظر ہی میرے نانا نے ان کا انتخاب کیا تھا۔ حالات نے ان کی کمر ضرور خمیدہ کر دی تھی لیکن ان کی آنکھوں کی چمک کبھی ماند نہ پڑی۔

میٹرک پاس کرنے تک میرے ذہن میں یہ بات اچھی طرح سما چکی تھی کہ میں اپنے سکول کی سب سے زیادہ حسین لڑکی ہوں اور میرا خاوند کوئی لکھ پتی گلفام ہی بن

سکتا ہے۔ یہ بات میرے لاشعور میں رچ بس گئی تھی کہ میرے پاس آسمان کی بلندیوں کو چھونے کے لئے صرف ایک ہی سیڑھی ہے میرا حسین سراپا! اگر میں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو ساری زندگی میاں کی طرح چولہا جھونکنے اور بچے جننے میں بیت جائے گی۔

میری طرح میری ماں کی سوچ بھی یہی تھی۔ شاید اس لئے وہ مجھے بنا سنوار کر رکھا کرتی تھی۔ کسی بھی تقریب میں نگاہوں کا مرکز صرف میری ذات بنتی تھی۔ میٹرک پاس کرتے ہی میرے لئے رشتے آنے شروع ہو گئے، لیکن میری ماں نے کسی کو در خور اعتنا نہ جانا۔ وہ تو کسی کروڑپتی کے ہاتھوں میں میرا ہاتھ دینا چاہتی تھی۔ خدا جانے یہ ابو کی بے پناہ مصروفیت یا ان کی لاعلمی کہ وہ ان باتوں سے لاتعلق رہتے۔ میری والدہ خود ہی آنے والوں سے باتیں کرتیں۔ دو تین دعوتیں ان کے ہاں میرے بہن بھائیوں کے ساتھ اڑاتیں اور بعد میں ٹکا سا جواب انہیں مل جاتا۔ ابو کے متعلق استفسار کرنے پر انہیں ایک ہی جواب ملتا۔

"انہوں نے اس معاملے میں مجھے مکمل اختیار دے رکھا ہے۔"

اس دوران میں نے ایف۔اے میں داخلہ لیا۔ لیکن ہمارے خاندان میں لڑکی کی شادی تھوڑی عمر میں ہی طے کر دی جاتی تھی۔ اس لئے میرے ایف۔اے کرنے کی امید کم ہی نظر آتی تھی، پھر میرا خیال تعلیم کی طرف تھا ہی کہاں۔ مجھے تو بس اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مستقبل کے سنہری سپنے ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان خوابوں نے مجھے تخیل پرست بنا دیا اور مزید دماغ روز روز رشتے کو آنے والوں نے خراب کر دیا۔ میں واقعی اپنے آپ کو اپسرا جاننے لگی۔

ایک روز ہمارے ایک دور کے رشتے کی خالہ نے میری والدہ سے اپنے بیٹے کے لئے میرا رشتہ مانگا۔ ان کا بیٹا ایف۔اے کر کے حال ہی میں ایک دفتر میں ملازم ہوا تھا۔ لڑکے کا نام خالد تھا۔ اتفاق سے خالد میرے ابو کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا اور عا

نوجوانوں سے بالکل الگ تھلگ۔ ابو سے اس کی ملاقات دفتر کی مسجد میں ہوا کرتی تھی۔ ابھی اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں ان کی بیٹی ہوں یا ابو ان کے دور کے رشتہ دار ہیں۔ یہ لوگ حال ہی میں ایک دوسرے شہر سے یہاں منتقل ہوئے تھے اور اپنے کچھ رشتہ داروں کا دم غنیمت جان کر ہمارے خاندان میں آنے جانے لگے۔ میری ایک کزن کی شادی پر خالد اور اس کی ماں نے مجھے دیکھا اور اپنے بیٹے کی خواہش پر ہی وہ بیچاری میرا رشتہ مانگنے چلی آئی تھی۔ جب امی کو علم ہوا کہ خالد ابو کے دفتر میں ہی کام کرتا ہے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بجائے شائستہ طریقے سے جواب دینے کے انہوں نے بیچاری خالہ کو بے نقط سنائیں اور ان سے الجھنے لگیں کہ آخر خالہ نے کس منہ سے ان کی ہیرے جیسی لڑکی کا رشتہ مانگا ہے۔

خالہ بیوہ عورت تھیں۔ خاوند جوانی ہی میں فوت ہو گیا۔ لے دے کر ایک بیٹا ہی ان کا سرمایہ حیات تھا۔ بیچاری نے خود کو تج کر بیٹے کو پالا پوسا اور اس قابل کیا تھا۔ ایک تو ان کی اپنی مرضی اور پر سے بیٹے کی خواہش جانے کتنے ارمانوں سے آئی تھیں وہ اب جو امی نے ایسا سلوک کیا تو بے بسی سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں حسب سابق دوسرے کمرے کے کواڑوں سے لگی سارا تماشہ دیکھ رہی تھی، نجانے کیوں مجھے خالہ پر رحم آنے لگا اور ایک نرم گوشہ میرے دل میں ان کے لئے آپ ہی آپ سے خالی ہو گیا۔

کسی طرح میرے والد صاحب کو اس بات کا علم ہو گیا۔ انہیں سخت صدمہ پہنچا۔ اب خالد کا کردار ان کے سامنے تھا اور اپنی مالی حیثیت کا احساس بھی انہیں خوب تھا۔ اس طرح تو میری ماں مجھے گھر بٹھا کر سودا بازی میں لگی رہتی اور ایک دن وہ بھی آ جاتا جب کوئی میری طرف دیکھنا گوارہ بھی نہ کرتا۔ شاید اسی روز بد سے بچنے کے لئے میرے ابو نے براہ راست معاملہ اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس روز وہ گھر واپس آئے تو امی مجھے بنا سنوار کر ایک رشتے دار کے ہاں کسی

تقریب پر لے جا رہی تھیں۔

"بشریٰ میری بات سنتی جانا بیٹی۔" نجانے ان کے لہجے میں ایسی کیا بات چھپی تھی کہ میں ٹھٹھرا کر رہ گئی۔

"کیا بات ہے؟ کیا مصیبت آ گئی؟" میری بجائے امی نے چلاتے ہوئے کہا۔

"خاموش رہو۔ مجھے اپنی بیٹی سے کچھ کہنا ہے۔" والد صاحب کی آواز آج قدرے اونچی تھی۔ اور انہوں نے یہ فقرہ بھی براہ راست امی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ادا کیا۔

"سبحان اللہ ساری زندگی تو خبر نہ لی آج بیٹی یاد آ گئی۔ کیا کیا ہے تم نے بیٹی کے لئے؟ کون سے سونے کے ہنس پہنا دیئے ہیں اسے؟" امی کا پارہ چڑھنے لگا۔

"ثریا خاموش رہو۔" ابو کے لہجے میں چھپے قہر کو میں نے محسوس کر لیا تھا۔

امی پہلے تو حیرت سے ان کی طرف دیکھتی رہیں۔ شاید وہ ابو کے اس روپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پھر غصے سے پیر پٹختی باہر نکل گئیں اور دوسرے کمرے میں جا کر رونے لگیں۔

"تم ادھر آؤ بیٹی۔" ابو نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں سحر زدہ سی ان کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں چلی آئی۔ وہ میرے قریب بیٹھ گئے اور بڑی شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

"بیٹی تم سمجھدار ہو اور حالات بھی تمہارے سامنے ہیں۔ جس راستے پر تمہاری ماں تمہیں لے جا رہی ہے وہاں سوائے ذلالت کے اور کچھ نہیں۔ میں نے تمہیں ایک ہی سبق سکھایا ہے کہ ہر حال میں قناعت کرو اور خدا کے شکر گزار رہو۔ میں اپنے ضمیر کے سامنے اس لئے بھی مطمئن ہوں کہ میں نے تمہاری فلاح کے لئے کبھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ بیٹی! ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی جس گھر میں جا

راج کرے اور زندگی کی تمام خوشیاں اس کی جھولی میں ڈال دیں، لیکن اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا۔ ایک باپ ہونے کے ناطے مجھے تمہارے ساتھ ایسی گفتگو کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے، لیکن تمہاری ماں میری آنکھوں کے سامنے تمہیں جہنم میں جھونک دے یہ میری برداشت سے باہر ہے۔

خالد جیسا شوہر کسی لڑکی کو خوش قسمتی سے ملتا ہے۔ کس بات کی کمی ہے اس میں شرافت، محنت کیا نہیں ہے اس کے پاس؟ دولت تو بیٹی ڈھلتی چھایا ہے یہ کسی کے آنگن میں کب بسیرا کرے کوئی نہیں جانتا۔ میری خواہش ہے کہ تمہاری نسبت خالد سے طے ہو۔ یہ بات اپنا حق جان کر ہی کہہ رہا ہوں اور اپنی نیک بیٹی سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ اپنے باپ کے جذبات کا احترام کرے گی۔" انہوں نے یہ ساری باتیں بڑے ملائم اور محبت بھرے لہجے میں میرے ذہن میں اتاریں۔ میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ ابو نے اپنی زندگی ہمارے نام کر دی اور کسی سے کبھی کچھ نہ مانگا۔ آج وہ اپنی بیٹی سے اپنا حق مانگ رہے تھے۔ میں سسک پڑی اور ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ میرے منہ سے بمشکل "ابو" نکل سکا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

اسی روز ابو خود خالہ کے گھر گئے اور امی کے سابقہ رویئے پر معذرت کرتے ہوئے انہوں نے خالہ کو گھر آنے کی دعوت دی۔ خالہ چھٹی کے روز ایک بزرگ کے ساتھ آئیں اور والد صاحب نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ آنے والے بزرگ نے امی کے رویئے پر تشویش ظاہر کی، لیکن ابو نے انہیں مطمئن کر دیا۔ جب امی کو پتہ چلا کہ ابو نے بات پکی کر لی ہے تو انہوں نے رو رو کر ابو اور مجھے بد دعائیں دے دے کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ابو ان تمام باتوں سے لاتعلق اپنے کمرے میں بیٹھے رہے اور میں پتھر کا بت بنی اپنے نصیبوں پر آنسو بہاتی رہی۔

میں نے ہاں تو کر دی، لیکن اپنا مستقبل مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ ایک کلرک مجھے

کیا دے سکتا تھا؟ میرے سارے سپنے ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر گئے۔ سارے ارمان دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئے۔ تشنہ خواہشات کے ساتھ زندگی کیسے بسر ہو گی؟ یہ سوچ کر میں دل مسوس کر رہ جاتی۔ گھر میں امی ابو کی چیخ چیخ اب روزانہ کا معمول بن کر رہ گئی۔ ابو کے رویئے میں بھی اب ایک درشتگی سی آ گئی تھی۔ وہ اکثر الجھے الجھے خود سے دست و گریباں سے دکھائی دینے لگے تھے۔

ایک سال اسی ذہنی عذاب میں گزر گیا۔ میں تو حالات سے اتنی بددل ہو چکی تھی کہ پڑھائی چھوڑ کر گھر بیٹھ رہی۔ پھر ایک روز سادہ سی تقریب میں میرا اور خالد کا نکاح بھی طے پا گیا۔ خالد تو اسی روز مجھے دلہن بنا کر لے جانے پر مصر تھا۔ لیکن ابو نے نجانے یہ کیوں گوارا نہ کیا۔ امی نے اس تقریب میں شرکت نہ کی اور ناراض ہو کر میکے چلی گئیں۔ انہوں نے میری رخصتی کی تقریب میں شرکت بھی با دل نخواستہ ہی کی تھی۔ اس دوران میں ان کی صرف ایک ہی خواہش رہی کہ کسی نہ کسی طرح میرا رشتہ ٹوٹ جائے۔ میری رخصتی پر وہ میرے گلے لگ کر روئیں تو بھی ایک ہی فقرہ ان کی زبان سے بار بار ادا ہو رہا تھا۔

"ہائے میری بیٹی کو جہنم میں جھونک دیا۔"

جن نامساعد حالات میں میری رخصتی ہوئی مجھے یقین تھا اب سسرال والے گن گن کر بدلے چکائیں گے کیونکہ میری ماں نے ان کی بے عزتی میں کبھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ لیکن پہلے ہی روز نتیجہ میری توقعات کے برعکس نکلا۔ سسرال میں میرا استقبال بہو کی نہیں بیٹی کی حیثیت سے کیا گیا۔ پہلی ہی رات میرے خاوند نے میرے تمام شکوک رفع کر دیئے۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ میری ماں کی کسی بات کا انہوں نے کبھی برا نہیں منایا اور یہ کہ انہوں نے "مہنگا سودا" نہیں کیا۔

دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ میرے خاوند نے حتی المقدور مجھے دنیا کی ہر

آسائش مہیا کی۔ ساس نے ماں سے بڑھ کر پیار دیا۔ دو سال بعد ننھا عاطف جب دنیا میں آیا تو گویا میں اپنے گھر کی سلطنت کی بے تاج ملکہ بن گئی۔ میری تمام جائز ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ ساس نے کبھی مجھے کسی بات کا حکم نہ دیا ننھے کو بھی زیادہ تر وہ خود ہی سنبھالتیں۔ اس دوران میں جب کبھی میں امی کے ہاں گئی یا وہ ہمارے ہاں آئیں انہوں نے مجھے کرید کرید کر سسرال کے خلاف باتیں پوچھنا چاہیں، لیکن کوئی گلہ مجھے ان سے ہوتا تو میں کہتی۔

"ضرور تو ڈرتی ہے بیٹی! میرا دل نہیں مانتا اس نصیبوں جلی بیوہ نے تجھے سکھی رکھا ہو۔" میری طرف سے حسب توقع جواب نہ ملنے پر وہ خود بخود بولنا شروع ہو جاتیں۔ خود سے کوئی نظریہ قائم کر کے اس پر خواہ مخواہ میری ساس سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتیں، جو بیچاری بیٹے اور بہو کی خوشنودی کے لئے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیتیں اور سر جھکائے ان کے طعنے سنتی رہتیں۔

شادی کو تین سال گزر گئے، لیکن حالات جوں کے توں رہے ہمارے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ خالد صبح دفتر چلے جاتے۔ شام کے بعد ان کی واپسی ہوتی۔ مہینے کے بعد پوری تنخواہ لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ مجھے مطمئن رکھنے کے لئے انہوں نے سو سو جتن کئے۔ میری ماں کی کڑوی کسیلی باتوں کو ہضم کیا، لیکن وہ زہر جو کم عمری سے امی نے میرے لاشعور میں گھول دیا تھا کی تلخیوں سے میں کبھی چھٹکارا نہ پا سکی۔ ایک خلش سی اندر ہی اندر مجھے بے چین کئے دیتی۔ جب کسی پارک میں سیر کرتے ہوئے کسی سینما ہال میں فلم دیکھتے ہوئے میں اپنے سے کئی گنا کمتر لڑکیوں کو قیمتی کپڑوں میں ملبوس، کاروں میں سوار خوشحالی اور فارغ البالی سے قہقہے لگاتے دیکھتی تو ایک بے نام سی خواہش میرے اندر ابھرنے لگتی۔ کاش میں بھی کسی ایسے ہی گھر میں بیاہی جاتی۔

کسی نہ کسی طور سے اس طوفان کو میں نے اپنے اندر ہی دبائے رکھا۔ لیکن تین

سال بعد اس خاموش گرداب میں پہلا کنکر خالد کے ایک دوست پرویز نے پھینکا اور اس میں ایسے ایسے بھنور اٹھے کہ میں جن میں ڈوب ڈوب کر ابھری اور ابھر ابھر کر ڈوبی۔ پہلی مرتبہ کسی نے مجھے میری اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ پرویز، خالد کے دفتر ہی میں کام کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ تو خالد سے کم تھی لیکن بڑے بڑے افسر اس کا پانی بھرتے تھے۔ وہ چند سو روپے تنخواہ وصول کرنے والا لکھ پتی کلرک تھا۔ شہر میں تین تو اس کی ذاتی ٹیکسیاں چل رہی تھیں جن کا علم سارے دفتر کو تھا اور حصہ داری میں جو کام اس نے سنبھال رکھے وہ اس کے علاوہ تھے۔ خالد جیسے شریف الطبع نوجوان سے اس کی دوستی کیوں تھی اس کا علم مجھے کافی دیر بعد ہوا۔ پرویز بڑا گھاگ نوجوان تھا وہ تجربہ کار شکاریوں کی طرح اپنے شکار کو بھگا بھگا کر اتنا تھکا دیا کرتا کہ وہ خود ہی اس کی جھولی میں آگرے۔

ہم سے ملاقات کے دوسرے ہی روز اس نے خالد کو اپنے ساتھ پکنک منانے کی دعوت دے ڈالی اور پہلی ہی دعوت میں ذو معنی فقروں میں اس نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ پھر تو ہر دوسرے ہفتے ہمارا یہ معمول بن گیا۔ پرویز ضد کر کے مجھ شاپنگ کے لئے لے جاتا اور میرے نہ نہ کرنے کے باوجود ہر دوسرے تیسرے ہفتے زبردستی ایک دو پیکٹ میری طرف سرکا دیتا۔ وہ دھیرے دھیرے میرے حواس پر چھاتا گیا اور میں اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آتی گئی۔ آہستہ آہستہ وہ دور بھی آیا جب میں نے اس کے ساتھ جانے کے لئے خالد سے اجازت لینا بھی چھوڑ دی۔ خود اس نے بھی تو کبھی اس بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ جب اسے احساس ہوا تو معاملہ اس کے بس سے باہر نکل گیا۔ ایک دو مرتبہ اس نے مجھے اشاروں کنایوں میں تصویر کا صحیح رخ دکھانے کی کوشش کی، لیکن میں نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔

”تمہیں شک ہے مجھ پر“ میں جھنجھلا کر اس سے کہتی۔

”بشریٰ خدا کے لئے عقل کے ناخن لو۔ تم بات کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ وہ میرا دوست ہے اور تم میری بیوی ہو اور زمانہ......“ وہ معذرتی لہجہ اختیار کرتا۔

”جہنم میں جائے زمانہ۔ جب ہمارے دل صاف ہیں تو کوئی ہم پر شک کیوں کرنے لگا۔“ میں اس کی بات کاٹ دیتی۔

”او میری جان تمہارے دل کا ایکسرے کوئی نہیں دیکھے گا۔ دنیا کو ہمارے ظاہر سے مطلب ہے باطن سے نہیں۔“ وہ ناصحانہ انداز میں کہتا۔

”تمہاری بات میرے پلے نہیں پڑتی۔“ میں بالآخر زچ ہو کر جواب دیتی اور وہ چپ چاپ عارف کو گود میں اٹھائے باہر نکل جاتا۔

میری امی کو جب پرویز کی اور میری ملاقات کا علم ہوا تو گویا بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ وہ مجھے کسی نہ کسی بہانے گھر بلا لیتیں پھر پرویز آن ٹپکتا اور میں گھنٹوں اس کی باتوں میں کھوئی رہتی۔ پرویز کی اپنی بیوی گاؤں میں اس کے والدین کے پاس رہتی تھی۔ شہر میں اس نے عالیشان مکان بنا رکھا تھا۔ جہاں وہ اکیلا رہا کرتا تھا۔

اس روز جب میں کسی کام سے بازار گئی تو راستے میں وہ مجھے مل گیا۔ ہم دونوں ایک ریستوران میں چلے آئے۔ عام حالت میں ایسے کسی ریستوران کے قریب پھٹکنے کی جرأت بھی نہ کر سکتی۔

”اچھا ہوا آپ آج راستے ہی میں مل گئیں۔“ اس نے بیرے کو مشروبات کا آرڈر دے کر بات کے لئے تمہید باندھی۔

”ورنہ کیا ہوتا......“ میں نے جانے کیوں اس سے کہہ دیا۔

”میں آپ کو اغوا کر کے لے جاتا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اتنی ہمت ہے آپ میں۔“ میں بھی باؤلی ہوئی جا رہی تھی۔

”ارے ہمت شہزادی (وہ مجھے اسی نام سے مخاطب کیا کرتا تھا) ایک بار آزما کر تو

دیکھو۔“اس کے لہجے میں چھپے اعتماد نے اس روز میرا ایمان بھی ڈگمگا دیا۔

مشروبات آنے تک ہم اسی طرح فقروں کا تبادلہ کرتے رہے۔ پھر وہ اصل مدعا کی طرف آ گیا۔ بڑی خوبصورتی سے اس نے بات امی اور میرے سسرال کے درمیان اختلافات سے شروع کی تھی۔

”ذہنی طور پر خالہ نے آپ کی شادی کو قبول نہیں کیا۔ آپ اتنی ظالم نظر تو نہیں آتیں کہ اس ماں کو جس نے آپ کو شہزادی بنانے کے خواب دیکھے تھے اس طرح دھتکار دیں کہ ان کا دل ٹوٹ جائے۔“

”میں مجبور تھی پرویز صاحب“ بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا۔ مجھے بعد میں اپنی غلطی کا احساس بھی ہوا۔

موجودہ زندگی کے تلخ حقائق کا احساس اور مستقبل کے سنہرے سپنے دکھا کر آہستہ آہستہ اس نے میرا ذہن ماؤف کر دیا۔

”مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا، شہزادی تم محلوں میں راج کرنے والی ہو۔ سڑکوں پر دھکے کھانا تمہیں زیب نہیں دیتا۔“ اس نے میری دکھتی رگ چھیڑی۔ میں سحر زدہ سی اس کی باتوں سے پگھلتی چلی گئی۔ اس نے کچھ اس انداز سے مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلایا کہ میری آنکھیں چھلک پڑیں اور مجھے خواہ مخواہ خود پر ترس آنے لگا پھر لوہا گرم دیکھ کر وہ فوراً چوٹ کر گیا۔

”شہزادی ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی روگ ضرور لگا ہوتا ہے۔ میری خواہش تھی تمہارے جیسی کسی اپسرا کو اپنے دل کی ملکہ بناؤں لیکن تمہاری طرح ماں باپ نے ایک جاہل عورت کے پلے باندھ دیا۔ ہم دونوں چاہیں تو مل کر ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں شہر والا مکان بھی تمہارے نام کرنے کے لئے تیار ہوں۔“ اس نے اپنے فقرے کا ردعمل میرے چہرے پر تلاش کرنے کے لئے

میری آنکھوں میں جھانکا۔

میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوئی جاتی تھیں۔ عقل پر تو جیسے پردہ پڑ گیا تھا۔ بچپن سے جوانی تک جو سہانے سپنے دیکھے تھے جب ان کی تعبیر نظر آئی تو دل نے چاہا بے اختیار بڑھ کر اسے تھام لوں۔ بے قابو ہوتے جذبات کی طنابیں کھینچنے کے لئے نیک تربیت کے جن قوی شکنجوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے پاس کہاں تھے۔ یہاں تو بے لگام جذبات تھے اور منہ زور خواہشوں کے کف اڑاتے گھوڑے جو ضمیر کی بانجھ کھیتی پر چڑھتے چلے آ رہے تھے۔ کتنے ہی شوریدہ سر جذبے جو خالد کی مخلصانہ محبت کی چٹان تلے دبے جانے کب سے سسکیاں بھر رہے تھے۔ اب گڑے مردوں کی طرح سر اٹھانے لگے۔ من ساگر سے اٹھنے والی ہر لہر پکارتی کہ ”پگلی! بڑھ کر زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کر لے۔

امی نے میرے لاشعور میں گلیمر لائف کا جو زہر گھولا تھا اس کی شدت سے میری نسیں پھٹنے لگیں۔ خالہ کا بے لوث انس، خاوند کی دیوانہ وار محبت، لخت جگر کی محبت کچھ بھی تو خواہشوں کے عفریت کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکا۔

”پرویز کہیں تمہارا دل تو مجھ سے نہیں بھر جائے گا۔“ زخمی ضمیر پر پھاہا رکھ کر میں نے اتمام حجت کے لئے کہہ دیا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو بشریٰ۔ میرا یہ فیصلہ جذباتی ضرور ہے لیکن میں نے حقائق کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے شاید یہی میری کامیابی کا راز بھی ہے ورنہ میں بھی آج خالد کی طرح ٹائپ رائٹر سے سر پھوڑ رہا ہوتا یا پھر تمہارے والد کی طرح فائلوں کی گرد میں کھویا ہوتا۔“ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

وہ بولتا رہا میں جذبات کے تیز دھاروں میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔ بالآخر میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ میرے اندر کی سرکش بشریٰ جسے ابھی تک میں نے کسی نہ کسی طور

دبائے رکھا تھا مجھ پر غالب آ گئی اور میں نے ہاں کہہ دی۔

اس روز شام کو جب خالد دفتر سے واپس آیا تو میں نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ پہلے تو وہ بٹر بٹر میرے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ بات تھی بھی ایسی۔

"مذاق کر رہی ہو بشریٰ۔" اس نے پرامید نظروں سے میری سمت دیکھا۔

"ایسے سنجیدہ فیصلے مذاق نہیں ہوتے۔" میں نے نظریں جھکائے جھکائے مختصر سا جواب دیا۔ خالد سن ہو کر رہ گیا۔ اس نے ایک لفظ نہ بولا اور چپ چاپ عارف کو لے کر باہر چلا گیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ اس بیچارے نے یہی سوچا ہوگا کہ میرا جذباتی فیصلہ ہے جب مستقبل پر غور کروں گی تو بدل جاؤں گی۔

"دیکھو بشریٰ میں تمہارے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بہر حال بہتر یہی ہے کہ تم کم از کم ایک ہفتہ سوچو۔ اپنے ابو، امی سے مشورہ لو ممکن ہے اس طرح......"

"مسٹر خالد اپنے برے بھلے کی ذمہ دار میں خود ہوں۔ میں کوئی دودھ پیتی بچی نہیں جو ہر بات کے لئے منہ اٹھا کر امی ابو کی طرف دیکھتی رہوں۔"

تھوڑی سی رد و قد کے بعد جب اس نے دیکھا کہ میرا فیصلہ اٹل ہے تو اس نے اپنے ترکش کا آخری تیر بھی پھینک دیا۔

"ٹھیک ہے اگر تمہارا یہ فیصلہ اٹل ہے تو عارف میرے پاس رہے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے مجھ سے نہیں چھین سکتی۔" اس کے لہجے میں چھپے عزم نے اس کی بات کی تصدیق کر دی تھی۔

جب ہوس دامنگیر ہو جائے تو خون کی چاہ، محبتوں کے رشتے سبھی کچھ توریت کے ذرات کی طرح بکھر جاتے ہیں۔ سنہرے مستقبل کے سپنوں کی پٹی میری آنکھوں پر اس ساون کے اندھے کی طرح بندھ گئی جسے ہرا ہی ہرا سوجھتا ہے۔ میں نے گلیمر اور

لگژری لائف کے لئے سبھی کچھ داؤ پر لگا دیا۔ آج سوچتی ہوں تو حیرانگی ہوتی ہے کہ جب اس گھر سے رخصت ہوتے وقت ننھا عارف میرا قدموں سے لپٹ رہا تھا تو میرا کلیجہ کیوں نہ پھٹا۔ شاید میری وہ آتما ہی مر چکی تھی جسے ممتا کہتے ہیں اور جو کسی عورت کو تخلیق کی قوت دے کر اسے خدائی صفت سے موصوف کیا کرتی ہے۔

خالد کی بے بسی کے آنسو، ننھے عارف کی التجائیں سبھی کچھ میرے خواہشات کے دیو کے سامنے یوں بہا جیسے تیز ہوا راکھ کو اڑا لے جاتی ہے۔ خالہ کو خالد نے کسی بہانے سے دوسرے شہر اپنے عزیز کے ہاں بھیج دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس المناک منظر کو وہ بیچاری بوڑھی عورت بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔

میں نے عارف کو بازو سے پکڑ کر الگ کر دیا۔ یہ کسی ماں کی سنگدلی کی انتہا تھی۔ لیکن میں نے کہا نا کہ اس لمحے مجھ سے خدا نے وہ صفت ہی چھین لی تھی...... میں ماں کی بجائے ایک عورت تھی اور بس!

میری اس سنگدلی پر خالد تڑپ اٹھا۔ اس نے چیختے چلّاتے عارف کو گود میں بھرا اور باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بھی اس گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر پرویز کار سمیت میرا منتظر تھا وہ مجھے لے کر اپنے گھر آ گیا جہاں اگلے روز خالد کا طلاق نامہ بھی پہنچ گیا۔

ایام عدت کے بعد ہم دونوں ازدواجی رشتے میں منسلک ہو گئے۔ میری ماں نے اس شادی میں بھرپور طریقے سے شرکت کی۔ ابو نہ آئے اور قول کے سچے ابو نے بڑے صدق سے اپنی بات نبھائی۔ مرتے دم بھی کہہ گئے کہ بشریٰ میرے جنازے کو ہاتھ نہ لگائے۔

پانچ سال کا عرصہ یوں گزرا کہ پل کی خبر نہ ہوئی صرف ایک ابو کی موت کا حادثہ ضرور تھا جو کبھی کبھی مجھے سوگوار کر دیتا ورنہ تو میرے پاس سوچنے کے لئے وقت ہی

نہیں تھا۔ پرویز نے جو کہا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ اس نے مجھے فرش سے عرش پر بٹھا دیا۔ ایک عرصے کے بعد جب خواہشوں نے حقیقت کا روپ دھارا تو میں ندیدے بچوں کی طرح آلائشوں سے چمٹ گئی اور دونوں ہاتھوں سے نوچ کھسوٹ شروع کر دی۔

اس دوران میری خواہش رہی کہ میں پھر سے ماں کا روپ دھاروں تاکہ عارف کی جدائی کی اذیت سے جو کبھی کبھی ایک انجانی خلش کی طرح مجھے کچوکے لگانے لگتی تھی نجات پاسکوں، لیکن پرویز نے دانستہ ایسا نہیں ہونے دیا۔ اصل میں وہ بڑا شریف قسم کا عیاش تھا۔ اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا وہ نہیں چاہتا کہ میں اپنی محبت اس کے اور اولاد کے درمیان بانٹ دوں۔ پھر اسے میرے سراپے سے محبت تھی جس میں ذرا سی تبدیلی بھی اسے گوارا نہیں تھی۔

پانچ سال تک ننھے عارف کی محبت کا زہر باد میرے اندر ہی اندر ایک ناسور کی طرح پکتا رہا، بالآخر پھٹ گیا۔ تب ان کربناک گھڑیوں کا آغاز ہوا کہ جن کے متعلق میں ابھی تک خوش فہمیوں کا شکار رہی تھی۔ پانچ سال کی عیاشانہ زندگی کا قرض میں نے اس ایک لمحے میں چکا دیا تھا جو لمحہ میرے لخت جگر کی اذیت ناک یادوں کی نذر ہوا۔ تب میں نے سوچا الٰہی یہ کیا غضب ہو گیا۔ بھلا کوئی خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹا کرتا ہے۔ میں نے تو جیتے جی خود کو زندہ درگور کر لیا تھا۔

پرویز نے میرے کرب کو محسوس کیا اور یہ بھی چاہا کہ اس درد لادوا کا مداوا کر سکے۔ لیکن ایسا چارہ گر تھا کون اس جہاں میں؟ ایک روز اسے بتائے بغیر میں خالد تک جا پہنچی۔ میں نے اسے دفتر کے باہر جا لیا۔ اف میرا خدایا کیسا روگ لگایا تھا۔ میں نے اس کو۔ تیس پینتیس کے خالد کے بجائے میرے سامنے بالوں میں چاندی لئے آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک اور چہرے پر عالم کا حزن و ملال سجائے ایک حرماں نصیب کھڑا تھا۔ اپنی بہن کے ذریعے مجھے اس بات کا علم تو ہو گیا تھا کہ اس نے دوسری شادی نہیں

کی۔ اس کی ایک دور کے رشتے کی بہن بیوہ ہو کر اپنے چار بچوں سمیت اس کے در پر آن پڑی تھی۔ جس نے ننھے عارف کو اپنے سگے بچوں کی طرح پالا اور اسے کبھی ماں کی کمی کا احساس نہ ہونے دیا۔ خالہ نے ابو کی موت کے بمشکل پندرہ بیس روز بعد زندگی کا قرض چکا دیا۔ اپنے آخری سانسوں تک اس کی ایک ہی تمنا رہی کہ اس کا خالد دلہن لے آئے۔ لیکن ایثار و وفا اور شرافت و انسانیت کے اس زندہ مجسمے نے تو جیسے اپنی زندگی اپنے بیٹے کے لئے تج دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ سائیکل ہاتھ میں پکڑے سڑک کے کنارے کنارے پیدل چلا جا رہا تھا۔ مجھے اچانک وہاں دیکھ کر چونک پڑا۔

"تم؟" اس کے ہونٹوں سے کراہ نکلی۔

"کیسے ہو؟ عارف کیسا ہے؟" میں نے ہونکا بھرا۔

"فرصت مل گئی اپنے بچے کو یاد کرنے کی۔" وہ تڑپ اٹھا۔

میں کٹ کر رہ گئی۔ سسکیوں نے اندر ہی اندر دم توڑ دیا۔ رندھے ہوئے گلے سے میں نے بمشکل کہا۔

"میں تم سب کی گنہگار ہوں! خدا کے لئے اور کچھ نہ کہنا۔ مجھے میرے بچے سے ملا دو۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مجھے اردگرد کے ماحول کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ آنسو میرے ضبط کے سارے بندھن توڑ کر میرے گالوں پر پھسل گئے اور نیکی و شرافت کا وہ مجسمہ پگھل گیا۔

"حوصلہ رکھو! مجھ میں انسانیت کے جراثیم ابھی مرے نہیں تم اپنے بیٹے سے ضرور ملو گی۔ کل مجھے ملنا۔" کہہ کر اس نے میری طرف دیکھے بغیر سائیکل پر پاؤں رکھا اور ہجرت کر گیا۔

میں سسکتی تڑپتی واپس آئی۔ وہ رات روز حساب کی طرح طویل ہو گئی۔ صبح میں

نے بے چینی سے اسے دفتر فون کر کے ملنے کا پوچھا۔

"دیکھو بشریٰ اسے میری کم ظرفی نہ سمجھنا۔ عارف کو میں نے کبھی نہیں بتایا کہ اس کی ماں کوئی اور ہے وہ میری بہن کو ہی اپنی ماں جانتا ہے۔ تم اس سے ملو لیکن اسے یہ علم نہ ہونے پائے کہ تم اس کی ماں ہو۔" اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر سیدھی سادی بات کہہ دی۔

"خالد خدا کے لئے میرے گناہوں کی اتنی کڑی سزا نہ دو! میں پہلے ہی کون سی سکھی ہوں۔" میں فون پر سسک اٹھی۔

"ایک بات کہوں بشریٰ" اس نے میرے رونے کو نظرانداز کرتے ہوئے بڑے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"ہوں" بمشکل میرے منہ سے نکلا۔

"تم نے زندگی کو جذبات سے باہر نکل کر سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی اور یہی تمہاری سب سے بڑی غلطی ہے۔ اب جب تمہیں اپنی بھول کا احساس ہوا ہے تو جس طرح جذباتی بن کر تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اسی طرح آج تم مجھ سے یہ خواہش کر رہی ہو کہ میں اپنے بچے کا مستقبل بھی تباہ کر دوں۔ یہ کبھی نہیں ہوگا بشریٰ! میں نے اپنی جوانی اپنے بچے کے لئے وقف کی ہے۔ اب میری محنتوں کو پھل لگنے لگا ہے تو تم اس میں کیڑے ڈالنے چلی آئی ہو۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے ایک دو لمحوں کے لئے سوچا اور دل پر پتھر رکھ کر کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے مجھے تمہارا فیصلہ منظور ہے۔"

"آج شام کو جب جی چاہے چلی آنا۔ لیکن پرویز کے ساتھ نہیں۔ میں بہرحال انسان ہوں۔" سلسلہ کٹ گیا۔

"تم فرشتے ہو خالد! فرشتے۔" میں نے زیرلب کہا اور فون کریڈل پر رکھ دیا۔

شام کو میں اس کے گھر جا پہنچی۔ میرا لختِ جگر باپ کے پاس بیٹھا سکول کا کام کر رہا تھا۔ اس نے غیرمانوس نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"سلام علیکم آنٹی۔" بڑے مودب لہجے میں اٹھ کر اس نے مجھے تعظیم دی۔

ہو بہو خالد پر گیا تھا۔ کتنی جلدی جوان ہو گیا میرا لال۔ خون نے جوش مارا تو سارے بندھن ٹوٹ گئے میں نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھیں اور اسے سینے سے لگا لیا۔ میرا خون بٹر بٹر میری آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ شاید اپنی کھوئی ہوئی ماں کو کھوج رہا تھا میرا کلیجہ اس کے نامانوس رویئے سے ضرور پھٹا۔ ہوک سی اٹھی اور جی چاہا کہ اسے سینے سے بھینچ کر چلا چلا کر کہوں کہ مجھے پہچانو میں ہی وہ بدقسمت عورت ہوں جس نے تمہیں جنم دے کر بھول جانا چاہا لیکن فطرت کے مضبوط بندھن کبھی کوئی توڑ بھی پایا ہے۔ سب کچھ چاہتے ہوئے میں اسے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ شریفانہ عہد جو میں نے ایک عظیم انسان سے کیا تھا آڑے آ گیا۔ پھر قانون قدرت بھی کوئی چیز ہے۔ مجھے اپنے کئے کی سزا تو بہرطور بھگتنی تھی۔

خالد نے اسے شاید پہلے سے میری آمد سے آگاہ کر رکھا تھا اور اسے بتایا ہوا تھا کہ آنے والی مہمان اس کی خالہ ہے۔ وہ ہم دونوں سے بظاہر لاتعلق سا خلاؤں میں اپنی جنت گم گشتہ کو ڈھونڈتا رہا۔

"آنٹی کے لئے چائے لاؤ بیٹا۔" اس نے عارف سے کہا۔

"جی اچھا ابو" کہہ کر وہ "اپنی امی" سے میرے لئے چائے لانے کو کہنے لگا جو سر پر سوتی دوپٹہ اوڑھے اس کمرے میں آ رہی تھی۔ میں نے اس عظیم عورت کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا لیکن اسے دیکھتے ہی جس تقدس اور طمانیت کا احساس ہوا اس سے کوئی بھی اس کی شخصیت کا اندازہ بخوبی کر سکتا تھا۔

اپنی بہن حمیدہ کو خالد نے تمام حالات سے آگاہ کر رکھا تھا۔ وہ بھی میری طرح

ماں تھی اور اولاد کی جدائی کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی۔ میں نے دکھ اور ہمدردی کی ملی جلی پرچھائیاں اس کی پرسکون آنکھوں میں لہراتی دیکھ لی تھیں۔ میرے لئے یہی کافی تھا۔ رات گئے تک میں اپنے بیٹے سے باتیں کرتی رہی۔ میں اس کے لئے بے شمار تحائف لے کر گئی تھی، لیکن اس نے تحائف وصول کرتے ہوئے کسی قسم کی سرگرمی نہ دکھائی یہ اس کی نسبی غیرت تھی جس نے میری گردن کو فخر سے بلند کر دیا۔

رات گئے میں واپس آگئی، پرویز کو علم تھا کہ میں اپنے بیٹے سے ملنے گئی ہوں اور اپنے گناہ کا احساس بھی۔ اس کا ضمیر اس کی توقعات کے برعکس ابھی تک زندہ تھا اور دوستی کے روپ میں اس نے جو گھناؤنا کھیل کھیلا تھا۔ اس پر وہ پچھتاوے کا شکار بھی رہنے لگا۔ لیکن آج تک اس نے کبھی بین السطور میں بھی اپنی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ اس نے شاید ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ اپنے پچھتاوے کی تلافی کے لئے اس نے مجھے عارف سے ملنے کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی اور خود بھی میرا حوصلہ قائم رکھتا۔

پھر تو جیسے عارف میرے وجود کا ایک حصہ بن کر رہ گیا۔ سکول، گھر، سیر و تفریح ہر جگہ ہم اکٹھے جاتے، گھومتے، جی بھر کے باتیں کرتے۔ میں نے کبھی خالد کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ پہلے ہی میں اس کی گنہگار تھی۔ اس کے ظرف کو سلام کہ اس کے باوجود اس نے کبھی میرے اور عارف کے ملنے پر اعتراض نہ کیا بلکہ یہ تک نہ کہا کہ اس طرح اس کا تعلیمی حرج ہوگا۔ میں اسے بیٹا کہہ کر ضرور مخاطب کرتی تھی لیکن یہ خیال ہمیشہ مجھے کچوکے دیتا رہا کہ اس کی "ماں" کوئی اور ہے۔

وقت کا پنچھی یوں پر لگا کر اڑا اور مہینے سالوں میں اس طرح بدلے کہ پندرہ سال گزرنے پر پتہ ہی نہ چلا -- میں نے پندرہ سال تک یہ روگ اپنے اندر پالا۔ پندرہ سال میں ہزاروں دفعہ جی چاہا اسے بتا دوں کہ تمہاری ماں میں ہوں کسی اور کو اپنی ماں بننے کا حق نہ دو، لیکن ہر دفعہ میں نے اس خواہش کو اندر ہی اندر مار لیا۔ قدرت نے بھی جیسے

مجھے عتاب کے لئے چن لیا تھا۔ اس کے بعد میری گود کبھی نہ بھری۔ پرویز نے چاہا کہ کسی طرح میرے دکھ کا مداوا ہو اور اولاد کے حصول کے لئے ملک بھر کے ماہرین سے رجوع کیا۔ لیکن تخلیق کی قوت پانے کے بعد میں نے اس منصب سے جو سلوک کیا تھا یہ اس کی سزا تھی کہ پھر آرزوؤں کی کھیتی کبھی ہری نہ ہوئی۔ تمناؤں کے سارے پھول چرمرا کر گر پڑے۔ کبھی کبھی میں سوچتی الٰہی دنیا میں لاکھوں انسان روزانہ حادثوں کی نذر ہو جاتے ہیں کتنے ان میں ایسے بھی ہوں گے جو زندگی کے روگ سے چھٹکارہ پا جاتے ہوں گے۔ کیا میرے لئے ابھی ور توبہ وا نہیں ہوا کہ سانسوں کا یہ سلسلہ جو عذاب کی مالا بن کر میرے وجود سے لپٹا ہے ٹوٹ جائے اور میں نجات پا جاؤں۔ لیکن زندگی جیسے انمول عطیے کو میں نے جس طور سے تضحیک کا نشانہ بنایا تھا شاید اسی کا ثمر تھا کہ مرنے کی دعائیں بھی مستجاب نہ ہوئیں۔

ایک روز جب عارف میرے پاس آیا تو اس نے خوشخبری سنائی کہ اس نے کمیشن حاصل کر لیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا کہ ابو نے بطور "انعام" اس کی خواہش پر اس کی اور ثمینہ کی منگنی کا فیصلہ کر لیا ہے۔

اس روز میں پہلی مرتبہ اندر سے مکمل طور پر ٹوٹی۔ اتنے اہم فیصلے کے لئے کسی نے میرا مشورہ لینا بھی گوارا نہ کیا۔ ثمینہ میری کزن محمودہ کی لڑکی تھی جس کے ساتھ میری کبھی نہ نبھی۔ بچپن ہی سے ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ کھچے کھچے رہے۔ ہم دونوں ہی نے کبھی ایک دوسرے کو منہ لگانا پسند نہ کیا۔ جب مجھے علم ہوا کہ میرے بیٹے کی منگنی محمودہ کی بیٹی سے طے پا رہی ہے تو میرے اندر کی بشریٰ ایک مرتبہ پھر جاگ اٹھی۔

اوہ خالد کتنا گہرا انتقام لیا تم نے۔ ایک چیخ میرے اندر سے اٹھی۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا کہ خالد سے اس مسئلے پر بات کروں۔ لیکن پھر انانیت آڑے آئی اور میں نے براہ راست عارف سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں سیدھی اس کے گھر جا پہنچی۔ خالد شاید کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

"ہیلو آنٹی آپ!" اس نے شاید اچانک مجھے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کیا تھا کیونکہ میں اس کے گھر اول تو جاتی ہی نہیں تھی اگر جانا بھی ہوتا تو پروگرام بنا کر جایا کرتی تھی۔

"ہاں بیٹے تم سے کچھ خاص بات کرنی تھی۔" میرے لہجے کی سنجیدگی کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔

"ارے بیٹھئے تو سہی آنٹی! میں امی کو بلاؤں۔" کہہ کر اس نے اٹھنا چاہا۔

"نہیں بیٹے" میں نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا۔

ضبط کا یارا کہاں تھا۔ سسکیاں بھرتے، آنسو بہاتے، رندھے ہوئے گلے سے میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ کمال تحمل سے میری باتیں سنتا رہا پھر اچانک اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں اس کے سلوک پر حیران رہ گئی۔ مجھے امید تھی کہ وہ "امی" کہہ کر میرے گلے لگ جائے گا اور برسوں کی وہ بھڑکتی آگ جس نے اندر ہی اندر مجھے راکھ کر ڈالا تھا ٹھنڈی پڑ جائے گی لیکن اس کا یہ سلوک میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں سہک سہک گئی عارف کی واپسی شربت کے ایک گلاس کے ساتھ ہوئی۔ اس نے گلاس مجھے تھما دیا اور خود ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ شاید بات کرنے کے لئے پر تول رہا تھا۔ فوجی بن گیا تھا نا!

"آنٹی" وہ میری سمت گھوما اور اس کا پہلا ہی لفظ برچھی بن کر میرے سینے میں ترازو ہو گیا۔ میں نے اس کے انداز تخاطب سے ہی اندازہ لگا لیا کہ ہمیشہ کی طرح ہار میرا مقدر بن گئی ہے۔

"جس بات کا انکشاف آپ آج فرما رہی ہیں اس کا علم مجھے بہت دیر پہلے سے ہے لیکن جس طرح ایک شریفانہ معاہدہ آپ کے اور ابو کے درمیان طے پایا ہے ویسا ہی ایک معاہدہ میرے اور ثمینہ کے درمیان بھی ہو چکا ہے۔ کچھ اصول اپنے باپ کی

طرف سے میرے خون میں منتقل ہوئے ہیں ان میں سے ایک عہد کی پاسداری بھی ہے۔ میرے ابو نے ایک عہد کی پاسداری کی اور آپ کے علاوہ دوسری کوئی عورت بیوی بن کر ان کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکی۔ اس طرح میں نے بھی ثمینہ سے ایک معاہدہ کیا تھا کہ جب بھی میں کسی قابل ہوا اس کا ہاتھ تھاموں گا۔ آج اس عہد کے ایفاء کا وقت آیا ہے تو آپ فرما رہی ہیں میں اپنے عظیم باپ کی روایت توڑ ڈالوں اور آپ کی صف میں شامل ہو جاؤں۔ میرے شعور میں وہ واقعات ابھی محفوظ ہیں جب آپ نے روتے ہوئے بچے کو دھتکار دیا تھا۔ کیا یہی چاہتی ہیں آپ کہ میں بھی آپ کی طرح بے وفا کہلاؤں۔" وہ بولتا رہا اس کے لفظ نیزے کی انی کی طرح میرے کلیجے میں اترتے رہے۔ پھر وہ پروقار چال چلتا کمرے سے نکل گیا اور مجھے یوں لگا جیسے اندر سے میری موت واقع ہو گئی ہے۔ (مرکزی خیال ماخوذ)

انانیت کی بھینٹ

اپنی کہانی شروع کرنے کے لئے مجھے کوئی "آغاز" میسر نہیں آرہا۔

میں نے زندگی کا سفر جہاں سے شروع کیا تھا۔ گھوم پھر کر وہیں آن کھڑا ہو ہوں۔ لیکن اب زندگی میرے ہاتھ سے ریت کی طرح پھسل رہی ہے۔ میرا کوئی آغا نہیں تھا کہ میں انجام کی فکر کروں۔ معلوم ہے ایک روز یونہی وقت کی ان خاردا راہوں پر دوڑتے دوڑتے میں جواب ہانپنے لگا ہوں گر کر مر جاؤں گا۔ لیکن کیا ہی اچھا کہ میری یہ کہانی اس سے پہلے آپ تک پہنچ جائے ممکن ہے کوئی اسے پڑھ کر اس انجا سے بچ نکلے جس سے میں دوچار ہونے جارہا ہوں۔

میرا نام ہاشم خان ہے۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ میرا تعلق کتنے بڑے خاندا سے ہے میرے پاس کیا نہیں تھا۔ دولت، عیش و آرام اور ایک شاندار اور محفو مستقبل۔ سب ہی کچھ مجھے میسر تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک اور چیز بھی ہو ہے -- محبت!

جی ہاں! بدقسمتی سے میں کبھی اس جذبے سے آشنائی حاصل نہ کر سکا۔ میں ۔ ہوش سنبھالا تو اپنے گھر میں نوکروں کی فوج اور دولت کی ریل پیل دیکھی۔ میر۔ والد اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ک

اپنے مزاج کے لحاظ سے وہ میرے سارے خاندان میں منفرد تھے۔

جاگیرداروں والی کوئی عادت ان میں نہیں تھی۔ وہ اپنے خاندان کے دوسرے لوگوں کے برعکس تعلیم یافتہ اور ادب نواز تھے۔ میری تباہی کی بنیاد میرے دادا نے میری پیدائش سے پہلے ہی رکھ دی تھی۔ ہمارے خاندان میں یہ رواج ہے کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی قسمت بھی ایک دوسرے سے منسوب کردی جاتی ہے۔

یہی کچھ میرے والد صاحب کے ساتھ ہوا۔ وہ جب اپنی گریجوایشن کر چکے تو انہیں آگاہ کیا گیا کہ ان کی شادی میری والدہ سے جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں طے پائی ہے اول تو والد ابھی شادی کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے اور دوسری وجہ ان کے اور میری والدہ کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کا نہ ہونا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ والد صاحب میں جہاں کوئی عادت جاگیرداروں اور نوابوں والی نہیں تھی وہاں والدہ میں ہر عادت نواب زادیوں والی تھی۔ وہ ولایت کی تعلیم یافتہ اور والد سے عمر میں بھی تین چار سال بڑی تھیں۔ والد صاحب نے دادا جان سے انکار تو نہ کیا۔ لیکن یہ ضرور کہا کہ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتے۔ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ والد کا ارادہ ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا۔

"روکا کس نے ہے بیٹا" -- دادا جان کی دور اندیش نظروں نے والد صاحب کے اندر پیدا ہونے والی بغاوت کو وقت سے پہلے دیکھ لیا تھا۔ "شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی جا سکتی ہے۔"

انہوں نے والد صاحب سے کہا۔

"یہ بڑا مشکل ہوگا" -- والد ڈرتے ڈرتے بولے

"کیا مشکل ہے" -- دادا جان نے تو زندگی میں کبھی ناسنی ہی نہیں تھی۔ کسی کی

جرأت تھی کہ ان کے کسی بھی فیصلے کی مذمت یا مخالفت کر سکے۔ والد تو فطری طور پر شریف تھے ورنہ ممکن ہے اپنی بات پر اڑ بھی جاتے۔

وہ جان گئے تھے کہ یہاں کوئی کام دادا جان کی مرضی کے بغیر ہونا ممکن نہیں۔ میرے والد بہت بہادر آدمی تھے۔ انہوں نے دادا جان کی خوشنودی اور اپنے خاندان کے جھوٹے رسم و رواج کی بھینٹ چڑھ جانے کا فیصلہ محض اس لئے کیا کہ ان کی ذات کوئی مسئلہ نہ بن سکے۔

شادی کے پہلے ہی سال میری پیدائش ہوئی۔ میں نے ہوش سنبھالا تو سب سے پہلے گھر میں ماں باپ کو جھگڑتے دیکھا میری ماں کسی کم رئیس گھرانے کی نہیں تھی۔ وہ بھی بہت بڑے جاگیرداروں کی بیٹی تھی۔ کیا مجال جو کبھی کسی بات میں کمی دکھائی ہو۔ وہ فطرتی طور پر جاگیردارانہ مزاج رکھتی تھیں۔ ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرنے کی عادی۔ ہر واقعہ کو اپنے خیالات کی مخصوص عینک سے دیکھنے والی۔ ان کی ہمیشہ یہی خواہش ہوتی کہ یہاں ان کی حکومت چلے۔ اس چھوٹی سی مملکت کی وہ بے تاج ملکہ کہلانا چاہتی تھیں۔

میری عمر پانچ سال ہوئی تو مجھے خاندانی روایات کے مطابق ملک کے ایک بڑے شہر کے بہت بڑے سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ سکول اتنا بڑا تھا کہ چھوٹے آدمی اس کے نزدیک پھٹکنے کی ہمت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں بورڈنگ میں داخل ہو گیا۔ دو تین مہینے بعد ایک دو روز کے لئے گاؤں چلا جاتا۔ اس دوران میرے والد ہی دراصل میری ماں کا کردار ادا کرتے آئے تھے۔ امی کے پاس میرے لئے ڈانٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

"یہ کپڑے کیوں میلے کئے؟"

"وہاں کیوں کھیلنے گئے تھے؟"

"دوپہر کو کیوں جاگ رہے ہو؟" وغیرہ وغیرہ۔

وہ شروع ہی سے مجھے الگ تھلگ رکھ کر یہ احساس دلانا چاہتی تھیں کہ میں بھی ان کی طرح کوئی بڑا ہی ارفع و اعلیٰ قسم کا انسان ہوں اور عام انسانوں سے ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔ ابتداء ہی سے میرے اندر ایک خوف سا پرورش پانے لگا تھا۔ مجھے والدہ سے ڈر لگتا۔ ہمارے گھر آئے دن بڑی بڑی دعوتیں ہوتیں جن میں رؤسا اور افسران اپنی بیگمات سمیت تشریف لاتے۔ میری والدہ ان پارٹیوں کی جان تھی--- لیکن والد عموماً ایسے مواقع پر گھر سے غائب رہتے۔

شاید ہی ان پانچ سالوں میں کوئی ایسا دن گزرا تھا۔ جب میرے والدین کی آپس میں تو تکار نہ ہوئی ہو۔ میرے والد جب کبھی مجھے اداس اور کھویا کھویا دیکھتے تو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر کبھی زمینوں پر اور کبھی شہر لے جاتے وہ گھنٹوں میرے ساتھ کھیلا کرتے۔ واپسی پر امی ان سے الجھ پڑتیں کہ وہ میری زندگی برباد کر رہے ہیں۔ وہ عموماً والد کو ایک فقرہ کہا کرتی تھیں۔

"ان حربوں سے تم اس کے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہو--- لیکن میری جوتی کو بھی اس کی پرواہ نہیں۔"

والد مسکرا کر وہاں سے واپس چلے جاتے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے--- "سلمیٰ! اس معصوم کے سامنے تو خدا کا خوف کر لیا کرو۔"

میں شہر پڑھنے آ گیا تو دوسرے تیسرے روز والد مجھے ستر اسی میل کا سفر طے کر کے ملنے آتے اور دو تین گھنٹے میرے ساتھ گزار کر واپس چلے جاتے۔ میں ان دنوں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس دوران گھر کے بھیدیوں نے مجھے والد کی شادی کی کہانی سنا دی تھی۔ ہر خاندان میں ایسے لوگ ضرور موجود رہتے ہیں جو موقع ملتے ہی ایک دوسرے کے خلاف کان بھرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے مجھے یہ کہانی

شاید اسی لئے سنائی ہوگی۔ لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک اعلیٰ تعلیمی درسگاہ نے مجھے بھی کچھ شعور بخشا تھا۔ بچپن ہی میں گھر سے دور رہنے کی وجہ سے میرا مشاہدہ بھی کچھ ہو چلا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے دادا اور میری ماں مل کر میرے والد کو آہستہ آہستہ قتل کر رہے تھے۔

اس سے پہلے معاملہ "اوئے توئے" تک ہی تھا۔ پھر نوبت گالی گلوچ پر آ گئی۔ بالآخر وہ بدقسمت دن بھی آ گیا جو میرے بخت پر ہمیشہ کے لئے سیاہی بکھیر گیا۔ شاید میرے والد اس روز بہت پریشان ہو کر گھر سے نکلے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی گاؤں کے نزدیکی ریلوے لائن پر عین اس لمحے ٹرین کے سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ جب انجن کو بریک لگنے کے مواقع بالکل ختم ہو چکے تھے یہ پھاٹک عموماً کھلا رہتا تھا۔ حال ہی میں ایک چوکیدار یہاں رکھا گیا تھا لیکن اس کی کیا مجال تھی کہ ہمارے گھرانے کی کوئی گاڑی دیکھ کر پھاٹک بند کر سکے۔ کتنی اذیت ناک موت کا انتخاب کیا تھا۔ میرے پیارے ابو نے--!!

یہ کچھ تو بہرحال ہونا تھا۔

میری عمر تب تھی ہی کتنی بمشکل بارہ تیرہ سال۔ یہ اطلاع مجھے اپنے ہوسٹل میں ٹیلیفون کے ذریعے ملی تھی کہ میرے باپ نے خودکشی کر لی ہے۔ آپ تصور نہیں کر سکتے کہ ایک بارہ تیرہ سال کے بچے پر اس اطلاع سے کیا قیامت ٹوٹی ہو گی۔ میرا سہارا سوا باپ کے اور تھا ہی کون-- ماں کو تو کبھی اپنے آپ سے فرصت نہ ملی تھی کہ وہ میری طرف متوجہ ہوتی۔

بعد میں مجھے علم ہوا کہ دادا جان کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی "ہمارے دشمن" نے مجھے فون کرنے کی جرأت کی تھی۔ ورنہ یہاں دادا جان کا حکم یہی تھا کہ میرے والد کی موت کو اتفاقی حادثہ قرار دیا جائے۔

ان کی دانست میں خودکشی کی خبر ان کے خاندان کی بدنامی کا باعث ہوتی۔ اس روز

جب میں اپنے والد کی لاش کے سرہانے کھڑا تھا تو پہلی مرتبہ اچانک روتے روتے میرے ذہن میں ایک عجیب وحشت ناک سی سوچ نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا آخر میرے والد کو خود بخود مرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اتنے پڑھے لکھے اور سمجھدار انسان تھے کہ زندگی میں کبھی مجھے ماں کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا۔ انہوں نے مرتے ہوئے یہ تو ضرور سوچا ہو گا کہ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔

میرا کیا بنے گا؟-- کیا مستقبل ہو گا میرا؟

یقیناً میرے والد نے مرنے سے پہلے یہ سب کچھ سوچا ہو گا، پھر آخر وہ کیوں مر گئے۔ جانے کتنے دکھی ہو گئے تھے وہ۔

اس سے پہلے میں اپنے دادا سے خوفزدہ رہتا تھا۔ آج میں ان کے لئے شدید نفرت محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اس المیے کے ذمہ دار صرف اور صرف میرے دادا جان اور ان کے وہ بے بنیاد اور کھوکھلے اصول ہیں جن کو وہ ہمیشہ اپنی انانیت کا مسئلہ بنائے رکھتے ہیں۔

میری ماں بار بار مجھ سے لپٹ کر روتی اور چلا چلا کر بین کرتی تھی کہ وہ گناہگار ہے اس کی بدقسمتی نے ہی اسے یہ دن دکھائے ہیں۔

والد کی موت پر میں نے اپنے تمام مزارعوں کو دھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا۔ میری طرح وہ بھی جانتے تھے کہ ان کے لئے اس بے رحم اور جھلسا دینے والے اذیت ناک ماحول میں اگر کوئی سائبان تھا تو وہ والد مرحوم تھے۔ جنہوں نے ہمیشہ انہیں دادا کے عتاب سے بچائے رکھا۔

آٹھ دس روز تک میں کھویا کھویا رہا۔ لیکن اس دوران ایک نامعلوم ساجذبہ میرے لاشعور میں پرورش پاتا رہا۔ والد کے چالیسویں تک مجھے گھر پر رکھا گیا۔ چالیسویں پر ایک خاندانی رسم ادا ہوئی اور میرے والد کی پگڑی میرے سر پر رکھ دی گئی۔ ان حالات

میں بھی دادا جان نے اپنے خاندانی رسم ورواج کو نہیں بھلایا تھا۔

میں ہوسٹل میں آگیا۔ اس دوران میرے رویئے سے جو بغاوت چھلکنے لگی تھی اس کا احساس میری ماں کو بھی ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے مجھے کچھ نہ کہا۔ غالباً وہ سمجھ رہی تھ کہ یہ وقتی ردعمل ہے اور وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ میں نارمل ہو جاؤں گا۔

میرے ہوسٹل واپس لوٹنے تک میرے والد کی خودکشی کی کہانی یہاں پہنچ چکی تھی۔ میرے ہم جماعت اس واقعے پر افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن وہ سب ب ضرور جتادیتے تھے کہ انہیں والد کی خودکشی کا علم ہو چکا ہے۔ نجانے مجھے کیوں محسوس ہوا کہ بجائے مجھ پر سہ دینے کے یہ لوگ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں غصے سے کھولنے لگتا۔

مجھے علم نہیں میرے اس ساتھی نے میرا مضحکہ اڑانے کی کوشش کی تھی یا واقع وہ مخلص تھا۔ لیکن جب اس نے کہا "ہاشم تمہارے ڈیڈی کی خودکشی کا بہت افسوس ہوا۔" میرا ہاتھ بے اختیار اٹھ گیا۔ اس لمحے نہ جانے مجھ میں کہاں سے ایسا شدید احساس نفرت اور غصہ سمٹ آیا تھا کہ میں نے اسے فحش گالیاں دیتے ہوئے مارنا شرور کر دیا۔ وہ بیچارہ عجیب وغریب حالات سے دوچار تھا۔ اسے شاید سمجھ نہیں آرہی تھی ک اس سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے۔

جب تک لوگ ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرتے وہ نیم بیہوش ہو چکا تھا۔ میں آج بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہمیں الگ نہ کر دیا جاتا تو جس طرح اس ک گردن میں نے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لی تھی۔ شاید اس کی جان ہی لے لیتا۔

اس درس گاہ کے اپنے کچھ اصول تھے۔ یہاں ایسی غلط حرکات برداشت نہیں ک جاتی تھیں خواہ کرنے والا کوئی بھی ہو۔

انکوائری ہوئی اور میرا قصور نکل آیا۔ میرے گھر والوں کو بلایا گیا۔ ایک چچا آ

جنہیں وارننگ تھمادی گئی کہ آئندہ یہ حرکت برداشت نہیں کی جائے گی۔ جرمانہ الگ ہو گیا۔ چچا نے اس حرکت کا نفسیاتی پس منظر جانے بغیر مجھے ڈانٹنا شروع کر دیا مجھے طیش آگیا اور میں نے ان کے سامنے بھی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر آئندہ کسی نے میرے باپ کے متعلق کوئی بات کہی تو میں اس کا یہی حشر کروں گا۔

چچا نے کچھ زیادہ ہی مرچ مسالہ لگا کر یہ دھمکی دادا جان کے کانوں تک پہنچادی۔ دوسرے روز وہ خود چلے آئے۔ پہلی مرتبہ وہ میرے سکول آئے تھے۔ زندگی میں پہلی مرتبہ ہی میں نے انہیں کچھ پشیمان بھی دیکھا تھا۔ لیکن جھکنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کی گردن جوں کی توں اکڑی رہی۔ وہ میرے متعلق دکھی ضرور تھے لیکن اپنی جھوٹی انانیت کی خاطر کھل کر اس بات کا اقرار نہیں کرتے تھے۔ دم رخصت مجھے بڑے پیار سے سمجھایا کہ میں آئندہ لڑائی جھگڑا نہ کروں۔ میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور وہ مجھے خاصے پیسے دے کر چلے گئے۔

میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا ہے کہ اس درگاہ میں کم حیثیت والا کوئی طالب علم نہیں تھا۔ جس لڑکے کو میں نے مارا تھا۔ اس وقت تو وہ ڈسپلن کی خاطر چپ رہا۔ لیکن اس نے یہ بات دل میں رکھی۔ ایک روز جب میں سکول سے چھٹی پر اپنے ہوسٹل کے کمرے میں پہنچا تو میرے کمرے کے دروازے پر ایک کارٹون لگا ہوا تھا جس میں ایک آدمی کو اپنی بیوی کے رویئے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کرتے دکھایا گیا تھا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے وہیں کھڑے ہو کر تمام لڑکوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ بھی بڑے گھروں کے لڑکے تھے۔ دو لڑکے مجھے مارنے کے لئے آگے بڑھے میں نے کمرے کے باہر رکھا گملا اٹھا کر ایک کے سر پر دے مارا۔ میرے سر پر تو خون سوار ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ان سب کو جان سے مار ڈالوں۔ میں

نے گملے کالوہے سے بنا ہوا اسٹینڈ اٹھالیا اور دیوانوں کی طرح ان سب پر پل پڑا۔

مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ کیا کر رہا ہوں۔ اچانک کوئی چیز میرے سر پر لگی۔ میں چکرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

ہوش آیا تو میرا سر پٹیوں میں بندھا ہوا تھا اور انگ انگ درد کر رہا تھا۔ میں ایک ہسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں پڑا تھا۔ ایک نرس میرے سرہانے کھڑی تھی۔ وہ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر کسی کو اطلاع کرنے باہر چلی گئی۔ دوسرے ہی لمحے میرے بورڈنگ ہاؤس کے انچارج اور ایک پولیس تھانیدار اندر آ گئے۔ تھانیدار کو علم ہو گا کہ میں کون ہوں۔ وہ خاصا مؤدب اور سہما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میرے ہوسٹل انچارج میری نفسیاتی پوزیشن کو شاید سمجھتے تھے۔ انہوں نے مجھے حوصلہ دیا اور قبل اس کے کہ میں کچھ بولوں۔ مجھے آرام سے لیٹے رہنے کی تلقین کی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ انچارج صاحب میرے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔ انہوں نے تھانیدار کو جس نے ایک ہاتھ میں گتے سے چپکائے کاغذ پکڑ رکھے تھے کہا کہ وہ باہر جائے اور جب میرے وارث آئیں گے تو اس کے بعد میرا بیان لکھے۔

تھانیدار "جی جی" کرتا باہر چلا گیا۔ میرے انچارج وہیں کرسی پر بیٹھ گئے اور میری دلجوئی کرنے لگے۔ انہوں نے مجھے سہارا دے کر بٹھایا اور دوائیاں دیں۔ خود مجھے دودھ پلایا۔ اس کے ساتھ مشفق استاد کی طرح مجھے سمجھاتے بھی رہے۔

قریباً شام ڈھلے میری والدہ، دادا جان، دو چچا اور ماموں پہنچ گئے۔ ماں آخر ماں ہوتی ہے۔ اس سے رہا نہ گیا اور ایام عدت کو بھی نظر انداز کر کے بضد ہو کر دادا کے ساتھ ہی چلی آئی مجھے پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر وہ رونے لگی لیکن میرا تو جیسے دل ہی پتھر ہو چکا تھا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جس لڑکے پر میں نے گملا پھینکا تھا اس کی حالت بڑی بگڑ

گئی تھی اور پرنسپل کو مجبوراً یہ کیس پولیس کو دینا پڑا۔ رات تک میرے اور اس کے ورثا کے درمیان مذاکرات ہوتے رہے۔ دونوں امیر پارٹیاں تھیں۔ اندر ہی اندر انہوں نے آپس میں صلح کر کے معاملہ گول کر دیا۔ لیکن ابھی میرے خلاف تادیبی کارروائی باقی تھی۔ اس مرتبہ گو کہ میرے انچارج صاحب نے میرے حق میں بیان دیا اور کہا کہ مجھے اشتعال دلایا گیا تھا۔ دوسری پارٹی نے بھی صلح کر لی تھی اس لئے شاید مجھے معافی مل گئی۔

بہر حال یہ لڑائی جھگڑا اب میرا آئے دن کا معمول بن چکا تھا۔ دو سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔

اس دوران ایک اور اہم واقعہ جو میری زندگی میں بھونچال لے آیا۔ میری والدہ کی دوسری شادی تھی۔ میری والدہ کسی چھوٹے گھر کی عورت نہیں تھیں کہ خاوند کے ساتھ وہ بھی "ستی" ہو جاتیں۔ وہ امیر، آزاد خیال اور پڑھی لکھی ہونے کے علاوہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد بھی تھیں جن کے لئے ان کا غم اب ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

شاید اپنے دکھ کا ازالہ انہوں نے اس طرح کیا کہ بیٹی کو بیاہ دیا۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ یہ شادی میری والدہ کی مرضی کے بغیر طے کر دی جاتی۔ ان کے سامنے تو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ وہ خود بھی اب زندگی سے تنگ آ چکی تھیں اگر خاوند کے مرنے پر کوئی امید کی کرن ان کی تاریک بیوگی میں جگمگا سکتی تھی تو وہ میں ان کا بیٹا تھا۔ لیکن وہ جان گئی تھیں کہ میرے لاشعور میں ان کے خلاف دلی نفرت کی چنگاری نے اب سلگنا شروع کر دیا ہے کوئی دن جاتا ہے کہ وہ شعلہ بن جائے۔

میں بنیادی طور پر ایک مظلوم بچہ تھا جس کا واحد روحانی سہارا اس کا باپ حالات کے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ میرے اندر اب معاشرے کے لئے جز نفرت کے اور کچھ

نہیں تھا۔ میں تلخی ایام کے ہاتھوں فرار چاہتا تھا اور فرار کا آسان راستہ مجھے دولت نے دکھادیا میرے پاس بے تحاشہ دولت تھی۔ دادا اور نانی میں جنگ شروع ہو چکی تھی دونوں چونکہ ایک سی فطرت رکھنے والے تھے۔ اس لئے یہی سمجھتے تھے کہ میرا پیار و بے تحاشہ دولت کے عوض خرید لیں گے۔ مجھے ہر مہینے ایک خطیر رقم ماں کی طرف سے اور پھر دادا جان کی طرف سے ملنے لگی۔

میٹرک میں پہنچنے تک میں سگریٹ نوشی۔ کبھی کبھی شراب نوشی بھی کرنے لگا پھر ایک روز میں اپنے ہی جیسے بگڑے ہوئے رئیس زادوں کے ساتھ بازار حسن میں گا سننے بھی چلا گیا۔

نیا ماحول، نئے لوگ، نئی قدریں، مجھے یہ تو احساس نہ ہوا کہ یہ کچھ تو سب ظاہر ظاہر ہے اندر سے تو بالکل کھوکھلا ہے۔ اس رقاصہ نے جس کے پاس مجھے پہلی بار جایا گیا۔ اپنی رسومات کے مطابق "نیا شکار" جان کر مجھے خصوصی توجہ دی اور میں پیار کا متلاشی تھا یہ سمجھ بیٹھا کہ جو کچھ بھی ہے بس یہی ہے۔ یہی تھی وہ ہستی جس تلاش کے لئے میں بھٹک رہا ہوں۔ آج گوہر خانم کو مل کر جیسے میری تلاش مکمل ہو ہے۔ میرے ہمراہ آنے والے اس میدان کے پرانے کھلاڑی تھے۔ انہوں نے یہ آنے سے پہلے میرا تعارف "موٹی مرغی" کی حیثیت سے کروادیا تھا۔

میری سادگی کا اندازہ کیجئے کہ جب ابتداء میں گوہر خانم نے مجھے پان پیش کیا تو کی یہی ادا مجھے مار گئی۔ دوران رقص وہ یہی تاثر دیتی رہی کہ میرے گرداگرد موجود گدھے ہیں اور اس محفل کا اگر کوئی ہیرو ہے تو وہ ہاشم خان ہے۔ دو سال تک میں خانم کے کوٹھے پر دولت لٹاتا اور بدبختیاں سمیٹتا رہا۔ وہ تربیت یافتہ خاندانی طوائف اور اپنے شکار کو پھنسائے رکھنے کے تمام گر جانتی تھی۔ اس نے مجھے جی بھر کے لوٹا۔ میں اب سکول سے ایک بڑے کالج میں پہنچ گیا تھا اور بہت جلد ہوسٹل کے

طلباء میں شمار ہونے لگا جو تعلیم کو بھی عیاشی کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس دوران دادا جان کی جہاندیدہ نظروں نے اندازہ کر لیا کہ میں غلط راستوں پر چل نکلا ہوں۔ میری سگریٹ اور شراب نوشی کا چرچا تو خاندان بھر میں تھا۔

ایک دو مرتبہ دادا نے سمجھانے کی کوشش کی تو والدہ پھر آڑے آئیں۔ انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور کبھی مجھے یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میرے پاس دولت کی کمی ہے۔ میرا ماہانہ خرچ اب سینکڑوں سے ہزاروں روپے میں پہنچ چکا تھا۔ مہینے میں بمشکل دو تین مرتبہ میں کالج میں اپنی شکل دکھاتا تھا لیکن میری حاضری مسلسل لگ رہی تھی۔

اپنے کالج کی یونین میں مجھے اپنی دولت اور بدمعاشی کے بل بوتے پر ممتاز حیثیت حاصل ہو چکی تھی وہ دور بڑا عجیب تھا۔ آئے روز طلباء کے ہنگامے اور توڑ پھوڑ کر کارروائیاں ہو رہی تھیں۔ مختلف ذرائع سے ہمیں اسلحہ اور پیسے بھی ملنے لگے تھے جن کا ہم بے دریغ استعمال کرتے تھے۔

دادا جان نے میری مسلسل بداعمالیوں سے بالآخر تنگ آکر ایک روز مجھے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میں نے توبہ نہ کی تو وہ میرا خرچہ بند کر دیں گے۔ اس موقعے پر میری والدہ آگے بڑھیں اور مجھے کہا کہ میں پیسوں کی بالکل فکر نہ کروں کیا مجال ہے جو انہوں نے ایک مرتبہ بھی مجھے ان حرکات سے منع کیا ہو۔ بس ان کے پاس تو دادا جان کے خلاف شکایتیں تھیں۔ جب موقع ملتا وہ پٹارہ کھول کر بیٹھ جاتیں۔ انہوں نے مجھے ابھی سے اس بات کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ دادا جان اور میرے چچا ہمارے حصے کی جائیداد ہڑپ کر جائیں گے۔

میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ مجھے سوائے گوہر خانم اور شراب و شباب کے اور کسی بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ گوہر خانم کے تقاضے بھی اب بڑھنے لگے تھے۔

اس نے ایک روز مجھے انتہائی اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاشم! کیا میں یونہی ساری زندگی تماش بینوں کے سامنے ناچتی رہوں گی۔ تم آخر مجھے اس گناہ کی زندگی سے نکال کیوں نہیں لیتے۔"

جو بات میں اپنی زبان پر لاتے ہوئے ہچکچاتا تھا وہ گوہر خانم نے کہہ ڈالی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ہمارا فرار یہاں سے ناممکن ہے۔

"پھر کیا کیا جائے؟" -- میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ان لوگوں کی کمزوری صرف دولت ہے ہاشم خان! تم اگر اماں کا منہ بند کرنے کے لئے پچاس ہزار روپے کا بندوبست کر لو تو وہ ہمیں بخوشی شادی کر کے یہاں سے جانے کی اجازت دے دے گی۔"

اس نے مجھ سے اتنی مختصر بات نہیں کی تھی جتنی مختصر میں نے سنائی ہے۔ یہ بات اس نے خاصے ہیر پھیر سے اور گھما پھرا کر کہی تھی، لیکن میں اس کے عشق میں جا... اندھا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اگر وہ مجھے حکم دیتی کہ آسمان سے تارے توڑ لاؤ تو میں اس کا یہ حکم بھی مان لیتا۔ اس روز جب میں گوہر خانم کے پہلو سے اٹھ کر ہوسٹل پہنچا تو مجھ پر عجیب مدہوشی طاری تھی۔ میری زندگی کا واحد مقصد اب صرف اور صرف گوہر خانم کا حصول رہ گیا تھا۔ ذہن اتنا ماؤف ہو چکا تھا کہ میں نے کبھی یہ نہ سوچا آخر مستقبل میں ہم کیا کریں گے؟

میں سے لے کر جاؤں گا کہاں؟

اس بھرے پرے جہان میں مجھے اماں بھی میسر آ سکتی ہے یا نہیں؟

بس ایک ہی نظریہ دل میں جڑ پکڑ چکا تھا کہ گوہر خانم سے شادی کر کے اپنے ... کی جائیداد لے کر الگ ہو جاؤں گا۔ اگر دادا جان نے الجھن پیدا کی تو ماں کے پاس دولت نہیں ہے وہ میرا منہ موتیوں سے بھر دے گی۔

ان پچاس ہزار روپوں کے حصول کے لئے میں نے بڑا سیدھا اور آسان راستہ اپنایا تھا۔ میں ان بگڑے ہوئے امیر زادوں کو جانتا تھا جو کبھی کبھی بطور شغل "ڈاکہ زنی" کر لیا کرتے تھے، انہوں نے مجھے بھی اس "کار خیر" میں حصہ لینے کی کئی مرتبہ دعوت دی لیکن مجھے چونکہ ابھی پیسوں کی کمی کا مسئلہ پیش نہیں آیا تھا اس لئے میں آمادہ نہ ہوا۔

اس مرتبہ میں نے ان کی دعوت کو نہ ٹھکرایا۔

انہیں ایک ایسی ویگن کی خبر مل گئی تھی جو مہینے کی ایک خاص تاریخ کو لاکھوں روپے کیش لے کر جایا کرتی تھی منصوبہ یہ بنا کہ ہم ایک قدرے ویران راہگذر پر اس ویگن کو روک کر لوٹ لیں گے جس میں ایک گن مین اور تین آدمی بیٹھے ہوں گے۔

ہم پانچ آدمی تھے تین کے پاس پستولیں اور دو کے پاس سٹین گنیں تھیں۔ اتنے زیادہ ہتھیار دیکھ کر ہی وہ چوکیدار سہم جاتا۔

وقت مقررہ پر منصوبے کے مطابق ہم ایک کار میں سوار اس جگہ پہنچ گئے۔ دوپہر کا وقت اور جون کا مہینہ غضب کی گرمی پڑ رہی تھی اور سڑک پر دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ویگن آتی دیکھ کر ہم اپنی اپنی جگہ چوکس ہو کر بیٹھ رہے۔ جیسے ہی ایک موڑ پر اس کی رفتار کم ہوئی ہمارا وہ ساتھی جو کار میں سوار تھا اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ ویگن رک گئی اور ہم آناً فاناً اس کے سواروں کے سروں پر مسلط ہو گئے۔ گرمی کی وجہ سے کھڑکیاں کھلی تھیں۔ ہم نے انہیں اسلحہ دکھا کر دھکا کر نیچے اتار لیا۔

چوکیدار کی رائفل چھین لی اور نوٹوں سے بھرا بیگ کار میں رکھ لیا۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت ہمارے ایک ساتھی نے فائر کر کے ویگن کے ٹائر پھاڑ دیئے اور ہم بھاگ نکلے۔ ہماری بدقسمتی کے وہاں سے روانگی کے بمشکل دو تین منٹ بعد ہی ایک کار وہاں سے گزری جسے لٹنے والوں نے روک کر اپنے لٹنے کی دہائی دی۔

یہ کار سوار کوئی پولیس آفیسر تھا اور کار بھی سرکاری تھی جس میں وائرلیس سسٹم لگا ہوا تھا۔ اس نے اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی اور ہم ابھی بمشکل چھ سات میل دور اس موڑ پر پہنچے ہی تھے جہاں سے ہم نے گھوم کر ایک ذیلی سڑک پر اترنا تھا کہ وہاں پہلے سے تیار پولیس کی جیپوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ مزید بدبختی کہ ہم نے فائرنگ کر کے نکل جانے کی کوشش کی لیکن بے سود۔

پولیس کی جوابی فائرنگ سے ہمارا ایک ساتھی مارا گیا۔ دو شدید زخمی ہو گئے۔ ہم نے ہتھیار پھینک دیئے۔ گرفتار ہوئے۔ کیس چلا۔ دو سال تک چلتا رہا۔ اس دوران والدہ نے کچھ پیروی کی۔ دادا جان قضائے الٰہی سے اس حادثے کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی انتقال کر گئے۔ والدہ اب خود تین بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔

دادا کے فوت ہوتے ہی تمام اقربا نے مقدمے کی پیروی چھوڑ دی۔ والدہ کے لئے اب کوئی "حریف" (دادا کے مرنے کے بعد) میدان میں نہیں رہا تھا۔ انہوں نے بھی ایک وکیل کے سپرد یہ معاملہ کر کے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

جیلیں اور حوالاتیں دولت کے سر پر کاٹی جاتی ہیں۔ باقی مقدمہ دار امیر لوگ تھے۔ ان کے وکیلوں نے پولیس کی ملی بھگت سے اس جرم کا محرک مجھے گردانا اور عدالت سے دس سال قید کی سزا ہو گئی۔ ان دس سالوں میں میں نے سینکڑوں خطوط اور پیغامات گوہر خانم، اپنی ماں، رشتہ داروں اور دوستوں کو بھیجے لیکن مجھے کوئی ملنے نہ آیا۔

دوران مقدمہ ہی مجھے اپنے گناہوں کا احساس ہو چلا تھا۔ میں نے سچے دل سے توبہ کر لی۔ جیل میں اچھے کردار کی وجہ سے معافی بھی ملتی رہی۔ یہیں میں نے بی اے بھی کر لیا۔ رہا ہو کر ماں کے پاس پہنچا تو انہوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ ماں نے کہا اپنے چچاؤں سے جائداد کا حصہ لے لو۔ جنہوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر اس طرف کا رخ کیا تو مارے جاؤ گے البتہ بطور خیرات کچھ دینے کا وعدہ کر لیا۔ ماں کے نئے

خاوند نے اپنے گھر میں میرا داخلہ بند کر دیا۔

جب ماں ہی مجھے نہیں پہچان رہی تھی تو اور کون پہچانتا۔ تب میں نے یہ عزم کیا کہ آج کے بعد کبھی اس طرف کا رخ نہیں کروں گا۔ میں نے اکیلے سفر کا آغاز کر دیا اور چلتا چلا جا رہا ہوں۔ سزا یافتہ مجرم ہونے کے ناطے میرے لئے کسی کے پاس "رحم" نہیں ہے۔

ایک پرائیویٹ دفتر میں کلرک بن کر زندگی گھسیٹ رہا ہوں -- شاید اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں۔

اس نے کہا تھا!

ٹرین گجرات پہنچی تو حوالدار نور محمد نے سکھ کا سانس لیا۔ وہ پچھلے تین چار روز سے مسلسل سفر کر رہے تھے۔ گلگت کے ایک دور دراز علاقے سے ان کی کمپنی کو اچانک ایک سرحدی علاقے میں پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے اور صبح انہیں سپیشل ٹرین پکڑنا تھی جسے دس بجے آنا تھا۔ کمپنی کے باقی جوان تو مسافر خانے میں جا گھسے صوبیدار جہاں داد اور اس کا بیٹا نائیک زمان حوالدار نور محمد سے باتیں کرتے رہے۔

"نورے آیار، میرا گھر سٹیشن کے قریب ہی ہے۔ رات وہیں گزارتے ہیں۔ صبح ہمارے ساتھ ہی واپس آجانا۔" صوبیدار نے تجویز پیش کی اور نورے نے نہ چاہتے ہوئے بھی ہامی بھرلی۔ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ ٹرین پر اتنا لمبا اور مسلسل سفر اس نے بخار کی حالت میں کبھی بھی کرنے کا تصور نہیں کیا تھا۔ تینوں سٹیشن سے پیدل ہی روانہ ہوئے تھے۔

صوبیدار جہاں داد گھر آگیا۔ وہ اور اس کا بیٹا تو دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے حوالدار نور محمد کو اسی کمرے میں لٹادیا۔ بخار نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا۔ نور محمد چارپائی پر گرتے ہی بے سدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اسے صرف اتنا یاد رہا کہ نائیک زمان نے اسے دودھ کے ساتھ اسپرین کھانے کو دی تھی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو سورج چڑھ آیا تھا۔ غالباً صوبیدار یا اس کے بیٹے نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ دونوں قریبی مسجد میں نماز ادا کرنے چلے گئے تھے۔ نائیک زمان کی گولی نے بھی جادو کا اثر دکھایا تھا۔ خوب پسینہ آنے سے اس کے جسم کے سارے مسام کھل گئے اور صبح تک اس کا بخار غائب ہو گیا۔ نورے نے چارپائی سے اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ نماز کا وقت تو گزر چکا تھا۔ پھر بھی وہ پانی کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صوبیدار کے آنے سے پہلے پہلے قریبی ٹیوب ویل سے نہا کر واپس آجائے اور ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کر کے واپس سٹیشن چلا جائے۔

اس نے اپنے سرہانے رکھا تولیہ اٹھایا اور دروازے پر پڑی چق اٹھا کر جونہی باہر نکلا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ہوں۔ ایک عورت سامنے دودھ کی بالٹی پکڑے آرہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ٹھٹھک گئے ایسا دکھائی دے رہا تھا جیسے دونوں کو سکتہ ہو گیا ہو۔

"نورے"--خاتون نے بمشکل کہا۔

"عائشہ"--نورا بھی ایک ہی لفظ کہہ پایا تھا اس کا ذہن کئی سال پیچھے چلا گیا۔

○

جالندھر کے ایک محلے کی گلی میں قطار در قطار بنے مکانوں میں سے ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی ہاتھ میں پیتل کا کٹورا پکڑے باہر نکلی۔ وہ سرمستی کے عالم میں بھاگتی ہوئی جا رہی تھی۔ اسی لمحے گلی کی ایک نکڑ والے مکان سے ایک پندرہ سالہ لڑکا باہر نکلا۔ جیسے وہ پہلے ہی سے اس کا منتظر ہو۔ نوجوان پر نظر پڑتے ہی لڑکی کی رفتار مین کچھ کمی آگئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ پھر سے سر پر جمایا۔ اب وہ آہستہ

آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آ گئی تھی۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کنکھیوں سے لڑکے کو دیکھا۔ عین اسی لمحے لڑکا بھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ٹکرائیں۔ ایک سرخی سی دونوں کے چہروں پر دوڑ گئی تب لڑکی نے اپنی رفتار ایک دم بڑھا دی۔ لڑکے کی نظریں گلی کے آخری موڑ تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ روزانہ کے معمول کے مطابق اس نے اس کی واپسی کا انتظار بھی وہیں کھڑے کھڑے کیا۔ واپسی پر بھی دونوں نے وہی عمل دہرایا۔ دونوں پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے اسی طرح ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھا کرتے تھے۔

اگلے روز ایک عجیب بات ہوئی!

آج لڑکے نے اس کا تعاقب بھی کرنا شروع کر دیا وہ اس طرح چھپ چھپ کر اس کے پیچھے جا رہا تھا کہ لڑکی کو اپنے تعاقب کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ وہ حسب معمول محلے کے باہر سڑک کے کنارے بنی مھنے پہلوان کی دوکان سے دہی خرید رہی تھی۔ لڑکی نے جیسے ہی مڑ کر اس کی طرف دیکھا اچانک گھبرا سی گئی۔ شرم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس نے تیزی سے سڑک پار کرنا چاہی، شاید اس نے وہ جیپ نظر انداز کر دی تھی جو اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ جیپ کا ڈرائیور اس اچانک صورتحال سے گھبرا گیا اس نے بریک لگانا چاہی لیکن پاؤں شاید ٹھیک سے نہ پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ جیپ لڑکی کو نگل جائے ایک کوندا سا لپکا۔ لڑکے نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ عین سڑک کے درمیان پہنچ کر لڑکی کو زور سے واپس دھکا دیا تھا۔ لڑکی تو بچ گئی لیکن وہ خود جیپ کے ایک مڈگارڈ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ وہاں موجود تمام لوگ حیرت زدہ سے دکھائی دے رہے تھے ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ لڑکی اس طرح بچا لی جائے گی۔ لڑکی کے ہاتھ سے دہی کا کٹورا پرے جا گرا تھا۔ وہ خود زمین پر گر پڑی تھی۔ چند ہی لمحوں میں ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اس نے پھٹی پھٹی نظروں

سے لڑکے کے زخمی سر کی طرف دیکھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اُس کا دل جیسے پھٹ گیا۔ اب لوگوں کا ہجوم ان دونوں کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ لوگوں کے ساتھ اسے زخمی حالت میں لے کر واپس آ رہی تھی۔

اگلے تین چار روز تک وہ اس دروازے کے سامنے رک رک کر بازار جاتی رہی۔ وہ ہر مرتبہ وہاں سے گزرتے ہوئے خالی خالی نظروں کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھتی۔ لیکن ہر مرتبہ دل مسوس کے رہ جاتی۔

پانچویں روز اچانک وہ اسے نظر آ گیا۔ اپنے سر پر پٹی باندھے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ آج تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر وہ اس کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئی۔ کسی ان دیکھی طاقت نے اسے وہاں کھڑا کر دیا تھا۔

"تو پاگل ہے کیا۔ اس روز تو نے مجھے بچانے کے لئے"...... اس کا فقرہ نامکمل ہی رہ گیا۔ اسے بولنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔

"تیرا نام کیا ہے؟" لڑکے نے اچانک پوچھا۔

"عائشہ اور تیرا؟" اس نے جواب اور سوال اکٹھا ہی کیا۔

"نور محمد --- نورا؟" اس نے بھی اتنا ہی کہا تھا کہ قریب ہی کسی قدموں کی چاپ سنائی دی لڑکی گھبرا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

پھر تو جیسے ان کا معمول ہو گیا۔ وہ اسی جگہ رک کر ایک آدھ نامکمل سی بات کر لیا کرتے تھے۔ ایک روز لڑکی وہاں سے گزری تو اس کا چہرہ اترا اترا دکھائی دے رہا تھا۔

"میں کل سے نہیں آؤں گی" --- اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"کیوں؟" نورے کو ایسا لگا جیسے کسی نے اسے پہاڑ سے دھکا دے دیا ہو۔

"آج میری کڑمائی ہو جائے گی۔ اماں کہتی ہے اب میرے سسرال والے برا مانیں گے۔" اس نے زخمی نظروں کو ایک لمحے کے لئے اٹھا کر پھر جھکا لیا۔ لیکن اتنے عرصے

میں جو قیامت نورے کے دل پر ٹوٹی تھی اسے بھی اس نے بخوبی محسوس کر لیا تھا۔

"کیا؟؟" اس کے گلے سے رندھی سی آواز نکلی۔ اچانک کسی نے نورے کو اند
سے آواز دی اور وہ گھبرا کر آگے بڑھ گئی۔ گلی کی نکڑ پر کھڑے ہو کر وہ دو تین منٹ تک
دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی۔ اسی اثناء میں اس نے دو تین بار اپ
چنری سے آنکھوں کو صاف بھی کیا۔ وہ باہر نہ نکلا تو عائشہ بوجھل بوجھل قدموں سے
آگے بڑھ گئی۔ واپسی پر بھی وہ موجود نہیں تھا۔ وہ جیسے کٹ کر رہ گئی۔

اس کی کڑمائی کے بمشکل ایک ڈیڑھ ماہ کے بعد ہی بٹوارا ہو گیا تھا۔ اس اثنا میں ا
کی ماں نے اسے ایک مرتبہ بھی تو باہر نہیں جانے دیا تھا۔ صرف ایک دن اس
بہانے سے اپنی سہیلی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ نورا ہر روز دروازے پر کھڑا کس
انتظار کیا کرتا ہے۔

"نورے تو ٹھیک ہے نا؟" خاتون نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"ہاں تم سناؤ خوش رہتی ہو؟" -- نورے کو محسوس ہو رہا تھا، جیسے رات کی سا
تھکن نے پلٹ کر اس پر حملہ کر دیا ہو۔

تو نے شادی کر لی کتنے بچے ہیں تیرے۔" خاتون نے اس سے بمشکل آنکھیں ملائی

"میں نے شادی نہیں کی" -- نورے نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی جس
طاقت اب جواب دے رہی تھی۔

"کیوں؟" اس کی زخمی نظریں دیکھ کر نورے کو کئی سال پہلے والی عائشہ یاد آ
جس نے ایک روز انہی نظروں کے ساتھ اسے اپنی کڑمائی کا المیہ بتایا تھا۔

اب تو خاتون کا بھی دل بیٹھنے لگا تھا۔ اس نے دودھ کی بالٹی زمین پر رکھ کر ق

دیوار کا سہارا لے لیا۔ نورے نے چاہا کہ آگے بڑھ جائے اسے خود سے زیادہ اس پر ترس آ رہا تھا۔ اچانک ایک آواز نے اسے روک لیا۔

"نورے ایک بات سنتے جاؤ!" خاتون کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

"کیا؟" نورے کو ڈر تھا اگر اسے دوبارہ کسی بات کا جواب دینا پڑا تو شاید وہ بول بھی نہ پائے گا۔

"ایک روز تم نے میری جان بچائی تھی نورے! میری زندگی بھر کا ثمر میری آس مراد، ایک ہی بیٹا ہے۔ زمان کا خیال رکھنا" -- آنسو اس کی آنکھوں سے گر کر اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"اچھا" کہہ کر حوالدار نور محمد تیزی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ گر نہ پڑے۔ مکان کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے دہلیز میں کھڑے ہو کر ایک نظر مڑ کر دیکھا۔ خاتون اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ ایک مرتبہ اسی طرح اس نے جالندھر کے ایک محلے کی ایک گلی کی نکڑ پر اپنی چنری سے اپنے آنسو پونچھے تھے۔

صوبیدار اپنے بیٹے کے ساتھ واپس آیا تو وہ واپس اسٹیشن جا چکا تھا وہ حیران رہ گیا۔

گولہ باری قیامت ڈھا رہی تھی۔ وہ ایک مورچے سے نائیک زمان کے ساتھ دشمن پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ ان کے دائیں ہاتھ ایک پہاڑی سے تین گورکھے ان کی طرف بڑھے اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ مشین گن کا منہ ان کی طرف پھیر سکے۔ نائیک زمان نے رائفل تھامی اور بجلی کے کوندھے کی طرح باہر کو لپکا۔ اس نے پہلے ہی ہلے میں ایک گورکھے کو جہنم واصل کر دیا۔ دوسرے گورکھے پر وہ سامنے سے حملہ آور ہو رہا تھا تو تیسرے نے چاہا کہ پیچھے سے اسے سنگین گھونپ دے۔ اس

اثناء میں حوالدار نور محمد عقاب کی طرح اس پر جھپٹا۔ گورکھے کی رائفل کی سنگین اس کی پسلیوں میں لگی تھی۔ لیکن اس نے اپنی تمام تر ٹریننگ بروئے کار لاکر گورکھے سے رائفل چھین کر سنگین اس کے سینے میں اتار دی۔ اس اثناء میں زمان دوسرے سے فارغ ہو چکا تھا۔ نور محمد نے اس کی طرف دیکھا تو جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس کے سینے سے خون بہہ رہا تھا۔

"زخم زیادہ تو نہیں-- ٹھیک ہو نا"

"بالکل ٹھیک ہوں حوالدار صاحب معمولی زخم ہے۔"

وہ دونوں اپنے مورچے میں پہنچ چکے تھے۔ نور محمد نے اس کی اور اپنی فیلڈ پٹی زمان کے پیٹ پر کس کر باندھ دی تھی۔

خود اس نے مورچے میں پڑا اپنا بڑا سا فوجی کوٹ پہن لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا زخم چھپا رہے۔

لڑائی رک گئی۔ مورچہ فتح ہو چکا تھا۔ وہ ایک خطرناک پہاڑی علاقے میں لڑ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک ایمبولینس وہاں تک پہنچی تھی اور صرف شدید زخمی ہی پیچھے لے جائے جا رہے تھے۔ باقیوں کا محاذ پر ہی علاج کیا جا رہا تھا۔ ایک آدمی کی گنجائش باقی رہ گئی تھی۔

"تم بیٹھو حوالدار!" صوبیدار کی جہاندید نے اس کے چہرے کی پیلی رنگت دیکھ کر اس کی حالت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ خون بے تحاشہ بہہ چکا تھا۔

"صوبیدار صاحب، میں بالکل ٹھیک ہوں معمولی زخم ہے۔ آپ زمان کو بھیجیں۔ اس کے پیٹ میں بڑا گہرا زخم لگا ہے"--

اسے تو نائیک زمان کی فکر کھائے جا رہی تھی! "اگر اسے کچھ ہو گیا"-- اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ پھر اس کی ضد کے پیش نظر زمان کو ایمبولینس میں بٹھا کر بھیج دیا گیا۔

نور محمد کو معمولی زخم نہیں آیا تھا۔ زہر میں بجھی سنگین نے اس کے سارے جسم میں آگ لگا دی تھی۔ جیسے ہی ایمبولینس آگے بڑھی وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

"کیا ہوا کیا ہوا؟"-- صوبیدار نے گھبرا کر اس کا بھاری کوٹ اوپر اٹھا کر دیکھا تو سہم گیا بہت گہرا زخم تھا۔ اسے یہ بات صاف سمجھ آگئی تھی کہ حوالدار نور محمد نے یہ سب کچھ اس کے بیٹے کی زندگی بچانے کے لئے کیا ہے۔

"نور محمد-- تم سے کس نے کہا تھا کہ تم میرے بیٹے کو بچانے کے لئے اپنی جان دے ڈالو بتاؤ نورے بتاؤ"--

صوبیدار نے اسے جھنجھوڑ ہی ڈالا تھا۔

حوالدار نور محمد کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"اس نے کہا تھا"

ایمبولینس پہاڑی کے گرداگرد بنی ہوئی سڑک کا چکر کاٹتی اس کی نظروں سے دور ہی دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی گردن اچانک ایک طرف ڈھلک گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسی لمحے کا منتظر ہو۔

اوما

یہ کانپور ہے بھارت کا ایک شہر!

جس میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے موضع ناگری، جو برہمنوں کا گاؤں ہے جس کے مالک برہمن ہیں۔ لیکن جہاں اچھوت، مسلمان اور عیسائی بھی رہتے ہیں۔ یوں تو یہاں اور قومیں بھی رہتی ہیں لیکن اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ یہاں کے مالک تو بہر حال اونچی جاتی کے براہمن ہی کہلائیں گے۔ ناگری کے ایک سمت پھولوں کے باغات ہیں اور ان سے ذرا ہٹ کر براہمنوں کی خوبصورت اور پر شکوہ حویلیاں جو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہیں۔ یہ حویلیاں بظاہر بہت ٹھنڈی اور پر سکون ہیں۔ صاف ستھرے مویشی خانوں سے تازہ بھوسی کی مہک آ رہی ہے۔ دودھیلی گائیں زبان باہر نکال کر اپنے بچھڑوں کے ماتھے چاٹ رہی ہیں۔ آنگن میں بچوں کا شور ہے۔ براہمن خاندان کی عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں حویلیوں کے ساتھ ساتھ لگائے گئے گلاب کے پھولوں کے باغات میں بھی سنائی دے رہی ہیں۔

یاقوت کی طرح سرخ اور شفق رنگ گلاب---

چاندنی رات کی برف ایسی دودھیا چاندنی کی طرح سفید اور معصوم گلاب پیلے پیلے گلاب جو اپنے قلب میں ہجر کی زردی اور تپش لئے ہوئے ہیں جن کی خوشبو اتنی تیز ہے

کہ دور دور تک پھیلے ہوئے ڈھلوان پر باغات میں بھی پھیلتی چلی گئی ہے۔ یہ خوشبو محبت کی طرح خاموش راز کی طرح پراسرار مدھم مدھم اور بہت ہی گہری ہے۔ ایسے سینکڑوں ہی گلاب ان باغات میں کھلے ہوئے ہیں۔ برہمن زادیوں کے سیاہ بالوں کی زینت بنیں گے--ان کے جوڑوں میں سجیں گے۔

برہمنوں کے محلات سے ذرا ہٹ کر گاؤں کے نچلی طرف بھارت ندی بہتی ہے۔ خاموش سی ندی چپ چاپ ندی--جس کے سینے میں برہمیت کی جانے کتنی داستانیں صدیوں سے چھپی ہوئی ہیں۔ اس کے کنارے کنارے یہاں بسنے والی مخلوق کی جھونپڑیوں کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہاں رہنے والے ہر شخص کے چہرے پر ایک ہی کہانی لکھی ہے۔

ناشاد آرزوؤں اور نارسیدہ امنگوں کی کہانی-! ترسی ہوئی نگاہوں- جھلسے ہوئے ہونٹوں کی کہانی-!

صدیوں کے فاقوں کی بھوکی اور بوسیدہ کہانی-! جس میں محبت مر گئی- عصمت لٹ گئی اور معصومیت بھکاری بن گئی۔ یہ وہی کہانی ہے جو انڈیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے- جس کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اگر ایک طرف اس نے کشمیر کی پہاڑیوں کو ڈھانپ رکھا ہے تو دوسری طرف راس کماری کے ساحلوں تک پھیلتی چلی گئی ہے۔

یہاں کی کہانیاں سب کہانیوں پر سبقت لے گئی ہیں۔ یہ وہ دھرتی ہے جو اپنی سندرتا اور حسن کے لئے دنیا بھر میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ جنوبی ہند کی اس دلفریب وادی کا یہ خطہ کتنا حسین ہے۔

چھوٹے چھوٹے پہاڑ کہیں گول گول چوٹیوں کے پھیلتے چھجے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پہاڑ نے دھوپ سے بچنے کے لئے چھاتہ اوڑھ لیا ہو۔ دور میلوں تک پھیلے ہوئے جنگل، دھان کے کھیت، کہیں پر دھان کی پنیری تو کہیں پر کٹائی- ایک جگہ دھان سبز

ہے تو دوسری جگہ پیلا ہو کر کٹنے کو تیار ہے- پھر پہاڑی علاقہ اور ڈھلانیں، بھیکڑ کی جھاڑیاں۔ دھوپ میں سنسناتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔ بھیکڑ اور کھجور کے درختوں میں گھومتی ہوئی نیلی نرم روندیاں اور لانبی دریائی گھاس میں چرتے ہوئے بیل بکریوں کے ریوڑ۔ سنگتروں کے باغ، جنگلی منڈھیروں پر ناگ پھنی کی جھاڑیاں- کہیں کہیں کوئی پرانا مندر اور نیلی آنکھوں والے تالاب، مندر جو فن تعمیر اور سنگتراشی کا شاہکار ہیں۔ یہ مندر ہیں جہاں سے بھرت ناٹیم اور کتھا کلی نے جنم لیا-جو صدیوں پر محیط ہندوستان کی تہذیب کا مرکز و محور رہے ہیں۔

وہ تہذیب جو انہی جنگلوں میں پل بڑھ کر جوان ہوئی اور انہی میں کہیں کھو کر رہ گئی۔

دھان کے کھیتوں ہی کے ایک کونے پر چند ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے نظر آ رہے ہیں۔ جہاں ان برہمنوں کی رعیت آباد ہے۔ جسے وہ "اچھوت" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگی کا مقصد برہمنوں کی خدمت کرنا۔ ان کے تعیش کے لئے خوبصورت لڑکیوں کو جنم دینا اور بالآخر کھانستے کھانستے مر جانا ہے۔ دھان کے کھیتوں میں بنے ان جھونپڑوں میں سے ایک میں برہمنوں کا پشت در پشت خادم کیشو رام بھی رہتا ہے جو ان کا مالی ہے جس نے گلاب کے پھول لگائے ہیں اور جس نے اپنے علاوہ اپنی بیٹی کو پھولوں سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ اس کے جھونپڑے کے چاروں طرف جنگلی گلاب کی بیل نے ایک جال سا تان رکھا ہے اور یہی چیز اس کے جھونپڑے کو دوسرے جھونپڑوں سے ممتاز کرتی ہے۔

جتنا پرانا یہ قصبہ ہے اتنی ہی پرانی اس برہمن خاندان کی تہذیب بھی ہے۔ یہ برہمنوں کا وہ روایتی گھرانہ ہے کہ جس کے مکینوں کے کانوں میں اگر صبح صبح کسی اچھوت کی آواز پڑ جاتی تو وہ اس کے کانوں میں پگھلتا ہوا سیسہ ڈال دیا کرتے تھے۔ برہمن کنیا کو دیکھ لینے پر ان کی آنکھیں نکال دی جاتی تھیں!--اچھوت جنہیں اپنے آقاؤں کے

مندروں میں پوجا کرنے کی اجازت نہیں تھی--!!

آج بھی اس خاندان کی یہی روایت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب گورنمنٹ نے اچھوتوں کو ہریجن بنا کر انہیں بھی قانونی طور پر عام انسان کا درجہ عطا کر دیا تھا--! اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ قانون کو یہاں تک پہنچنے کی اول تو اجازت ہی نہیں تھی اس لئے کہ تمام اعلیٰ حکومتی عہدوں پر کم از کم اپنے صوبے کی حد تک یہی خاندان قابض تھا اور اگر قانون یہاں تک پہنچ بھی جاتا تو ان محکموں میں سے کسی کو فریاد سننے کی جرأت بھی نہ ہوتی- کیونکہ اس حرکت کی قیمت جو انہیں ادا کرنی پڑتی تھی وہ ان کے تصور سے بھی زیادہ تھی-!

اتنی بھیانک سزا ملتی تھی کہ اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

کیشو رام کے جھونپڑے کے سامنے دھان کے کھیتوں کے دوسری طرف بھی کچے مکانوں کا ایک سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے ان مکانوں میں سے ایک میں ماسٹر نور محمد بھی رہتے ہیں۔ سفید داڑھی اور سرخ چہرے والے ماسٹر نور محمد! ہر وقت برہمنوں کی آنکھ میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان کی دشمنی بھی بہت پرانی ہے۔

دراصل برہمنوں کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ تعلیم کا اجالا اس قصبے میں نہ پھیلنے پائے۔ کیونکہ اس طرح ان کی رعیت کو وہ سیاہ اور گھناؤنے اندھیرے نظر آجائیں گے۔ جنہوں نے براہمنوں کے گورے چٹے جسموں میں گھر کر رکھا ہے۔ ماسٹر صاحب ناگری قصبے کے دوسری طرف واقع ایک گاؤں میں بنے سرکاری سکول میں ماسٹر ہیں۔ وہ روزانہ پانچ میل سائیکل چلا کر جاتے ہیں اور پھر واپس آتے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے ناگری میں سکول کھولنے کے لئے حکومت کو کئی درخواستیں دے رکھی ہیں لیکن جب بھی کوئی معائنہ ٹیم محکمہ تعلیم کی طرف سے یہاں آنے کو تیار ہوتی ہے اسے راستے ہی میں روک کر حساب بیباق کر دیا جاتا ہے۔

براہمنوں کی ایک قدیم شکار گاہ ناگری کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی گئی ہے۔ ان جنگلات کے بھی وہی مالک ہیں۔ سنا ہے یہاں کبھی شیر چیتے وغیرہ بھی پائے جاتے تھے لیکن اب نہیں۔ انہوں نے شاید خون آشام براہمنوں کے ڈر سے سنیاس لے لیا تھا۔

"شکار" اس براہمن خاندان کو ورثے میں ملا ہے۔ جانوروں کا بھی اور انسانوں کا بھی!

بستی کے اچھوتوں کے لئے مسلمانوں کے یہ چند گھرانے اسی نرک میں سورگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں ان کو چند لمحوں کا سکون مل جاتا ہے۔ ماسٹر نور محمد رات کو انہیں ریڈیو پر جہان بھر کی خبریں اور اخبار سے دنیا بھر کی باتیں سنایا کرتے ہیں۔ کتنی عجیب اور حیران ہوتی ہیں یہ باتیں---!!! ایک دم ناقابلِ یقین۔

کیشو رام نے کئی بار سوچا کتنا عجیب ہے ان کا دھرم اور ان کی باتیں بھی، لو بھلا یہ بھی کبھی ہوا ہے کہ دنیا کے سب انسان برابر ہوں۔ زندگی پر سب کا ایک جیسا حق ہو!! نہیں جھوٹ بالکل جھوٹ۔

ماسٹر نور محمد کی باتوں پر تو ہو یا نہ ہو لیکن ماسٹر صاحب پر کیشو رام کو مکمل اعتبار تھا۔ رام پیاری تو اوما کو جنم دینے کے دو سال بعد ہی رام کو پیاری ہو گئی تھی لیکن اس کی نشانی ابھی تک اس کے پاس تھی۔ صبح کام پر جاتے وقت وہ اوما کو ماسٹر صاحب کے ہاں چھوڑ جاتا دن بھر وہ ان کے بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ ماسٹر صاحب اپنے بچوں کی طرح اس کے ہاتھ میں بھی قاعدہ دے دیتے اور وہ سب کے ساتھ مل کر پڑھتی۔

برہمنوں کے مندروں میں اچھوتوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی اور اپنے لئے مندر وہ تعمیر نہ کر سکتے تھے۔ اس لئے زندگی بھر مذہب کا مقصد جو ان کی سمجھ میں آتا تھا وہ یہی تھا کہ برہمنوں کی خدمت کرتے کرتے مر جاؤ۔

ننھی اوما نے بچپن سے لڑکپن میں قدم رکھنا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اس کا بچپن

ماسٹر صاحب ہی کے گھر میں گزرا تھا۔ لہٰذا اس نے اب ماحول کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ شام کو اس کا کاکا اس کے لئے گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لے آتا اور صبح کو وہ ماسٹر صاحب کے گھر پھولوں کا گلدستہ لے جاتی۔ بس یہی تھی اس کی دن بھر کی مصروفیت۔

اوما کے لئے ماسٹر صاحب کے گھر میں دلچسپی کی ہر شے موجود تھی جبکہ اپنے گھر کے ارد گرد اسے گلاب کے پھول دھان کے کھیت اور ڈرے ڈرے سہمے سہمے لوگوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کبھی کبھی پنڈت دوار کا داس یا اس کا کوئی اور رشتہ دار اس طرف سیر کو نکل جاتا تو تمام لوگ ڈر کے مارے اپنے جھونپڑوں میں چھپ جاتے۔

ننھی اوما یہ سب کچھ چپ چاپ دیکھتی رہتی لیکن اس کی سمجھ میں کبھی کچھ نہ آتا۔ وہ اپنے کاکا سے کہتی۔

ماسٹر صاحب کے گھر میں تو کوئی کسی سے ڈر کر نہیں چھپتا۔ وہاں تو سب لوگ ایک ہی جگہ کھاتے ہیں لیکن یہاں، یہ تضاد آخر کیوں؟ اور اس کیوں کا اسے کبھی کوئی جواب نہ ملتا؟ گاندھی کے ہریجن کہہ دینے سے اچھوت خدا کے بیٹے تو بننے سے رہے۔

کیشو رام شام کو تھکا ہارا گھر لوٹتا اور اس کا منہ چومتا تو ایک لمحے کو اس کے ذہن میں ایک جالا سا تن جاتا اور جب یہ فضا صاف ہوتی تو اس پر رام پیاری کی تصویر ابھرتی۔ رام پیاری جو اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں میں کام کیا کرتی تھی جس کا گندمی رنگ اب گلاب کے پیلے پھولوں جیسا ہو گیا تھا۔ پیلے گلاب کے کئی بوٹے اس نے اپنے ارد گرد لگا رکھے تھے۔ پھر ایک روز وہ دھان کے انہی کھیتوں میں لال رنگ کا خون تھوک تھوک کر مر گئی۔ کیشو رام نے تو اسے مرتے سمے بھی نہیں دیکھا تھا۔ بس لوگوں سے ہی معلوم پڑا تھا اس کے مرنے کا۔

اسے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ اس کی ارتھی کو کس نے پھونکا تھا۔ بس ایک ڈھیر

ساتھا راکھا کا جس کے ایک طرف سفید ڈاڑھی اور سرخ چہرے والے ماسٹر نور محمد کھڑے تھے اور دوسری طرف ننھی اوما اسی کا ہاتھ تھامے کھڑی تھی!

حیران سی ننھی منی بچی اپنے کھوئے کھوئے سے باپو کو دیکھ رہی تھی جو پاگلوں کی طرح آگ اور دھوئیں کی لپٹوں کو گھور رہا تھا۔

اس روز بھی وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ اچانک ایک آواز سنائی دی۔ ''کیشو'' منشی مہنگا مل نے ایک چھناکے کے ساتھ اس کی سوچوں کا تانا بانا منتشر کر دیا۔

''آیا مہاراج''--! اس نے اوما کا منہ چوم کر اسے ایک طرف کر دیا اور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا۔

اوما نے ایک نظر بھاگتے ہوئے باپ پر ڈالی اور باہر نکل کر گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بنانے لگی۔ ماسٹر صاحب کی بیوی نے حسب معمول اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ اس سے گلدستہ لے کر ایک طرف رکھا اور قاعدہ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

قریبی گاؤں سے آئے ہوئے ماسٹر صاحب کے دوست کے بیٹے راشد نے ایک نظر اس سانولی سی لڑکی کو دیکھا جس نے بڑی بڑی معصوم آنکھوں میں نجانے کتنا سحر سمیٹ رکھا تھا اور اس کو بے ساختہ اپنے سکول کے ساتھ والے گرجے کی وہ نن یاد آ گئی جس نے ایک بار اسے گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا اور ہر روز اسے مٹھائی اور پھل کھلایا کرتی تھی۔

راشد قریبی گاؤں کے ایک مسلمان کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ اس سکول کا چپراسی تھا جہاں ماسٹر نور محمد پڑھایا کرتے تھے۔ خود بے اولاد ہونے کی وجہ سے وہ تمام مسلمان اور اچھوت بچوں کو اپنے ہی بچے سمجھتے تھے لیکن راشد کو انہوں نے بچپن ہی سے اپنی زیر نگہداشت رکھا تھا اور اسے اب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بڑی تگ و دو کے بعد کانپور کے ایک مشنری سکول میں داخل کروا دیا تھا۔ راشد کو گاؤں کے زہریلے برہمنی ماحول سے بچانے کے لئے انہوں نے وہاں ایک ہوسٹل میں داخلہ دلا دیا تھا۔

وہ اسے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے اور راشد نے انہیں اپنے باپ کا درجہ دیا تھا۔ اس کا باپ ایک روز ایک ٹھاکر کے ٹریکٹر تلے آکر کچلا گیا تو وہ ماسٹر صاحب کا ہی ہو کر رہ گیا کیونکہ اس نے ماں نام کی کوئی شے جنم لینے کے بعد نہیں دیکھی تھی۔ اس کی ماں نے تو جیسے اسے جنم دینے کے لئے ہی چند سانسیں بچا رکھی تھیں۔

دوپہر کا سناٹا رفتہ رفتہ گہرا ہوتا گیا۔ وہی سناٹا جو ناگری کے ہرے بھرے کھیتوں والے علاقے کی فضاؤں پر ہمیشہ چھایا رہتا ہے۔ دھان کے کھیتوں سے پرے بھارت ندی بڑی آہستہ خرامی سے جانے کب سے اسی طرح بہتی آ رہی تھی۔ اس کے کنارے کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے جنگلوں میں ناگری کے برہمنوں کے ہاتھوں جانے کتنی اچھوت دوشیزاؤں کی عصمت دری ہوئی تھی۔ یہ سب مناظر اس کے دیکھے ہوئے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے تعلق ہمالیہ پربت کے ریشی ایسی بے تعلقی سے بہے چلی جا رہی تھی۔

''شہر کے سب لوگ ایسے ہی کپڑے پہنتے ہیں کیا؟''

''ننھی اوما نے گیلی مٹی کا مکان بناتے بناتے راشد سے پوچھا۔''

''اور کیا نہیں تو''-- اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''راشد بابو کسی روز مجھے بھی شہر لے جاؤ نا۔''

اس نے شہر کی باتیں تو راشد سے اکثر پوچھی تھیں لیکن شہر جانے کی فرمائش آج پہلی بار کی تھی اور ننھا راشد حیران تھا آخر اسے کیا جواب دے۔

''تم ماسٹر چاچا سے کہو نا--'' بالآخر اس نے سوچ سمجھ کر اوما سے کہا۔

اور اسی روز اوما نے ماسٹر صاحب سے بھی کہہ ہی ڈالا۔

''اچھا اچھا لے چلیں گے کسی روز''--!

وہ بھاگتی بھاگتی اپنے کاکا کو یہ خوشخبری سنانے چل دی جو ابھی کام سے واپس

آیا تھا۔

"نہ بیٹا! ہم تو غریب لوگ ہیں ہم شہر نہیں جایا کرتے۔"

"لیکن کاکا کملا اور روپا بھی تو روزانہ شہر میں پڑھنے جاتی ہیں۔"

"میری بچی! وہ تو دھنوان ہیں! بڑے لوگ ہیں۔ ہمارے مالک ہیں۔ ہم ان کی برابری تو نہیں کر سکتے۔" اس نے بڑی محنت سے اوما کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے سمجھایا۔

لیکن بالآخر اسے اپنی بیٹی کی ضد ماننا پڑی۔ ایک بار پھر بڑی شدت سے اس کے دل میں ماسٹر جی کے لئے عقیدت کے جذبات جاگ پڑے جو اس کی بیٹی کو اتنی شدت سے چاہتے تھے ایک اچھوت کی بیٹی کو جس کا سایہ بھی اس کے مالکوں کے نزدیک منحوس تھا۔

پھر ایک روز اوما ماسٹر جی کے ساتھ کانپور چلی آئی۔ شہر کی بڑی بڑی سڑکیں۔ عمارتیں، گاڑیاں اور آتے جاتے مصروف لوگوں کو وہ ایک عجوبہ کی طرح دیکھ رہی تھی۔ اتنی بھیڑ بھاڑ کا تصور ہی اس کے لئے محال تھا۔

راشد اسے اپنے ساتھ سکول لے گیا جہاں ایک گرجے کی نن نے ان دونوں کو پیار کیا اور پھل بھی کھلائے۔

"ماسٹر جی میں گاؤں نہیں جاؤں گی۔" اس نے واپسی پر مچلتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی پھر آئیں گے تمہارے باپو کے ساتھ۔" ماسٹر صاحب نے اسے بمشکل ٹالا۔

"راشد جب میں اپنے باپو کے ساتھ آؤں گی نا! پھر واپس گاؤں نہیں جاؤں گی۔"

وہ ہانپتے ہوئے راشد کو سب کچھ بتا رہی تھی۔

صبح کے بھیگے ہوئے سناٹے میں اوما نے دھان کے کھیتوں پر نظر ڈالی جن کے دونوں اطراف کچی منڈیروں پر بیری اور ببول کے پیڑ جھکے ہوئے تھے۔ ندی کی طرف جانے والی پگڈنڈی اور اس ٹیلے پر نظر ڈالی جہاں دور دیس کے آنے والے پرکھوں کی وہ

پرانی بھوری اور شکستہ خانقاہ بنی ہوئی تھی جس کی دیواروں کی اینٹوں میں سے اگ کر لمبی لمبی گھاس باہر کو جھک آئی تھی۔ پھر وہ کھلی ہواؤں کی مہک، رہٹ کے چلنے کی آواز بیل گاڑیوں اور ادھوں کے پہیوں سے پیدا ہونے والے شور اور ان میں سے نکلنے والی طرح طرح کی صداؤں میں کھو کر رہ گئی۔ ان سب چیزوں کو اس نے دوبارہ دیکھا ان کی واقعیت اور مکمل پن کو محسوس کیا وہ کسان مرد اور عورتیں جو دن بھر اسے کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر اپنے اپنے کام میں مصروف ادھر ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے اسی دھرتی کے بیٹے تھے۔ ان کی زبان لب و لہجہ گیت، دکھ سکھ اور وہ فضا جس میں وہ پیدا ہوئے یہی تھی۔

وہ سب اسی اپنی کے دیوتا تھے۔ حیات کی ارتقا کے دیوتا۔ لیکن یہ صدیوں کا بیمار سکوت یہ غلاظت یہ سارے بوجھ جو ایک دم اکٹھے ہو کر ان پر سوار ہو گئے ہیں اس نے سوچا۔

یہ پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس انسان نما گدھے جو صبح سے شام تک کیڑوں کی طرح رینگتے رہتے ہیں۔ یہی کچھ سوچتی وہ ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر چلتی رہی جہاں راشد اس کا منتظر تھا۔

قریبی مندر سے پجاری کے اشلوک پڑھنے کی آوزیں آرہی تھیں۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ اس حرامی کا ٹینٹوا اتنی زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں ابل کر باہر آجائیں۔ اس کی جھوٹی زبان دانتوں سے باہر نکل کر چلا چلا کر کہے۔

"ہم جھوٹے ہیں صدیوں سے جھوٹے، رذیل اور کمینے چلے آرہے ہیں۔ ہماری ساری زندگی جھوٹی ہے۔ ہماری موت بھی جھوٹی ہوگی، ہم۔ ہماری تہذیب، ہمارا سماج، ہمارا دھرم سب کچھ جھوٹا ہے۔ ہماری ہر چیز جھوٹی فرسودہ اور ٹھکرائی ہوئی ہے۔"

اس نے سوچا ان کی زیست اور موت میں کیا فرق ہے؟

اچانک راشد اسے اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس کی زندہ اور ٹھوس شخصیت نے اوما کے تخیل کو تیرہ و تار کر دیا۔ جیسے تاریک و سیاہ بادلوں سے بھرے ہوئے آسمان پر بجلی کوند جائے اور ساری کائنات کو اپنی تابانیوں سے منور کرتی چلی جائے۔ اس کا سارا غصہ فرد ہو گیا اور وہ مبہوت ہو کر راشد کو آتے ہوئے دیکھنے لگی۔!

اسے دیکھ کر اوما کی چال میں لغزش پیدا ہو گئی۔ اس کے قدم آہستہ ہو گئے۔ وہ دونوں اب اس تنگ سی راہگزر پر جسے دونوں طرف سے دھان کی فصلوں بھرے کھیت نے ڈھانپ رکھا تھا ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ اوما کے سر پر اوڑھے سفید دوپٹے میں سے اس کے شانوں پر لہراتے ہوئے گیسو اس کے حسن کو اور بھی تابدار کر رہے تھے۔ اس کے چہرے پر ایک جاں بخش تازگی تھی اور رسیلے ہونٹوں کے کونے نہ جانے کون سے جذبے کے زیر اثر کانپ رہے تھے۔ راشد کی نگاہیں رعب حسن کی تاب نہ لاتے ہوئے جھک گئیں۔

"کیسی ہو اوما؟" اس نے بمشکل یہ لفظ ادا کئے۔

جواب میں اوما مسکرا دی۔ جیسے مونالیزا کی تصویر میں جان پڑ جائے مسکراہٹ جس میں چاشنی نزاکت اور چاندنی گھلی ہوئی تھی۔ جس میں ایک حسین ترین نغمے کی مکمل عنایت موجود تھی۔ اس کا دل بڑی شدت سے چاہا کہ اوما یونہی مسکراتی رہے۔

"بابو جی تو ٹھیک ہیں نا؟"

اور جواب میں اس نے اوما کے چہرے پر گلاب کے پھول کھلتے ہوئے دیکھے۔

راشد کے دل میں شدت سے اسے اپنے سینے میں سما لینے کی خواہش پیدا ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح اس نے اپنے احساس کی اس ضدی جبلت کو دبا دیا۔ وہ حیران رہ جاتا۔ جب بار بار دبائے جانے پر بھی یہ احساس دل کے کسی کونے سے پھر ابھر آتا تھا۔ وہ اس جنسی کشش کو خوب سمجھتا تھا۔ لیکن یہ کشش ہر بار ایک ضدی بچے کی طرح مچل اٹھتی تھی۔

وہ سوچا کرتا کہ دو جوان مرد عورت ایک دوسرے سے نا آشنا ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے محبت نہ کرتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک کیوں ہو جاتے ہیں کہ ساری کائنات گھوم گھما کر ایک ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور زمین آسمان کا یہ سنہرا سنگم ان کی دھڑکنوں میں اس طرح سما جاتا ہے کہ لاکھ کوشش پر بھی وہ یہ نہیں جان پاتے کہ وہ ایک ہیں یا دو؟

"آپ کہاں کھو گئے؟"۔ اوما نے اسے کھوئے کھوئے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں"۔۔ سوچوں کا طلسم ٹوٹ گیا۔

"میں تو سوچ رہا تھا گلاب کے یہ سفید سرخ اور پیلے پیلے پھول کتنے بھلے لگتے ہیں اور ان کی مہک کتنی عجیب ہے۔" اس نے اوما کے ہاتھ میں پکڑے گلاب کے پھولوں کے گلدستے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بابو جی! میں آپ ہی کے لئے لے کر جا رہی ہوں۔ کل ماسٹر جی نے کہا تھا آپ رات کو آجائیں گے۔"

"اوما۔"

"ہوں۔"

"ایک بات پوچھوں۔"

"پوچھئے"۔! اس نے غزالی آنکھیں اوپر اٹھا دیں۔

"تم رات کو اچھی طرح سو بھی سکیں تھیں کیا؟"

اور جواب میں اوما ہنستی ہوئی وحشی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھر کر بھاگ گئی۔ کیونکہ قریب ہی کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔

یہ پنڈت دوار کا داس کا بیٹا پرکاش تھا جو گورنمنٹ کا بہت بڑا عہدیدار تھا اور کبھی کبھی زبان کا ذائقہ بدلنے کیلئے اپنے آبائی گاؤں چلا آتا تھا جہاں اس کی جاگیر میں

اچھوتوں کی نوجوان چھوکریاں رہا کرتی تھیں جن کے نمکین اور لچکدار جسموں کی طلب اسے دیوانہ بنادیا کرتی تھی-! اور جن کی روحوں اور جسموں کو وہ اپنے باپ کی ملکیت سمجھتا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتا تاکہ اتنے بدصورت لوگ اتنی خوبصورت لڑکیوں کو کیسے جنم دیتے ہیں۔

سال بھر میں وہ ایک دو دفعہ اپنے گاؤں آتا اور ہر دفعہ کسی نہ کسی بد قسمت کو اس کے بستر کی زینت بننا پڑتا۔ یہ لہو کچھ ایسا اس کے منہ لگا تھا کہ اب چھٹتا نظر نہیں آتا تھا۔ آج بھی وہ اس چکر میں ادھر آنکلا تھا۔ جہاں اس نے اوما کی بھاگتے ہوئے ایک جھلک دیکھی تھی اور دل تھام لیا تھا۔ پھر اس کی نگاہیں راشد کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ گھاگ اور مکار آنکھوں والے برہمن زادے نے ایک ہی لمحے کے ٹکراؤ میں ان آنکھوں میں تڑپتی کہانی کا ایک ایک لفظ پڑھ لیا۔ ایک حقارت بھری نظر اس نے راشد پر ڈالی۔ اس نوجوان پر جس نے ان کی صدیوں سے غلام قوم کی لڑکی کو اپنانے کا ناقابل معافی جرم کیا تھا بھلا کس کو یہ حق حاصل تھا کہ ان کی جاگیر میں بسی ہوئی کسی بھی چیز کو اپنا جانے-؟

"کون ہو؟" اس نے بڑی رعونت سے پوچھا۔

"جی میرا نام راشد ہے۔"

"اوہ! اس ماسٹر کے کچھ لگتے ہو"--"گردن مزید اکڑ گئی۔" کیسے آنا ہوا؟ تم تو غالباً کانپور میں پڑھتے ہو۔"

"جی چھٹیوں میں یہاں چلا آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، لیکن اپنی حیثیت کبھی نہ بھولنا۔" اس نے تیزی سے کہا اور ایک طرف چل دیا۔

راشد کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

راشد نے ندی کی طرف جاتے ہوئے ایک نظر ان کسانوں پر ڈالی جو اپنے گھاس کے گٹھوں کے قریب ہی پڑے سو رہے تھے۔ ان کے چہروں سے چاند چمک رہا تھا۔ تارے مسکرا رہے تھے۔ کھیتوں کی نازک لطیف ہوا اپنے دوش پر پھولوں کی مہک لئے ان کی مدھم سانس کو مہکائے دے رہی تھی۔ ساری دھرتی سے ایک سوندھی سوندھی باس اٹھ رہی تھی۔ جیسے دھرتی نے اپنی نرم و گداز آغوش ان پر وا کر دی ہو۔ ساون کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں انہیں تھپک تھپک کر کہہ رہی تھیں۔

"سو جاؤ--میرے بیٹو--ماں کی آغوش میں سو جاؤ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔"

راشد نے سوچا بے شک خطرہ وہیں ہوتا ہے جہاں بنگلے بنے ہوتے ہیں۔ یہاں کون سا خطرہ ہے۔

وہ تیز قدموں سے ندی کے کنارے لگے اس درخت کی طرف چل دیا۔ جس سے ٹیک لگائے اوما اس کی منتظر تھی۔ اسے اوما سے بے پناہ محبت تھی اور

بلکہ ندی کی ساری روانگی اور اس کی گہرائی موجود تھی۔ اس گہرائی سے اسے ڈر لگتا تھا۔ اب اگر وہ چاہتا بھی تو اس جذبے کو اپنی روح سے اکھاڑ کر پھینک نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہیولے نے اس کے سارے ذہنی افق کو مستور کر دیا تھا اور سانس کی ہر دھڑکن زیست کی ہر حرکت میں اسے اس لمحے کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا۔ ہر وقت اس کی روح پر ایک گہری اداسی کا پر تو چھلکتا رہتا۔ شاید اس کی روح اپنی انفرادیت کو کھو کر اپنی انا کو کسی دوسری ہستی میں مدغم کر رہی تھی اور یہ احساس چاہے کتنا ہی پیارا کیوں نہ ہو ضرور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس اداسی میں شیرینی بھی تھی اور اذیت بھی، لیکن یہ اذیت بھی کتنی شیریں تھی۔ اس نئے احساس نے اس کی زندگی میں نئے معانی پیدا کر دیئے تھے اور اس کی روح کو اک نئی خوبصورتی، نئی تابانی اور نئی جمالیت سے معمور کر دیا تھا۔ اس سے پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا-!

"راشد بابو۔"

"ہوں"۔

"صبح تم چلے جاؤ گے۔"

"پھر آ بھی تو جاؤں گا! تو ہر دفعہ ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔"

"راشد اس دفعہ میرا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہا ہے۔ بھگوان جانے کیا ہونے والا ہے۔ میرا دل اس طرح پہلے کبھی نہ دھڑکا تھا۔"

"ایسی باتیں سوچا ہی نہ کرو۔ دیکھو چاند کی طرف وہ بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آگیا ہے ہمیں دیکھنے کے لئے۔ یہ چاند بھی کتنی عجیب شے ہے۔ جانے کتنے پریمیوں کو پیار کرتے دیکھتا ہے روزانہ، لیکن ایک کا راز دوسرے کو نہیں بتایا۔" وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان خوبصورت لمحات کو اپنے اور اوما کے ذہن میں پیدا ہونے والے وسوسوں کی بھینٹ چڑھا دے۔ بہت دیر تک وہ درخت کے تنے سے لگے باتیں کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ مدھم مدھم سرگوشیاں بیچ بیچ میں خاموشی۔ قربت کی شہد آگیں خاموشی اس لمحے زندگی اور زمین کی گردش اپنے محور پر گھومتے گھومتے رک گئی تھی اور ساری کائنات ایک طویل کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ دکھائی دینے لگی تھی۔

"راشد بابو! اب تو جی چاہتا ہے چپکے سے اسی طرح سو جاؤں۔" اوما نے اپنے سر کو اس کے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟"

"اتنی خوشی برداشت جو نہیں ہوتی۔"

"ہٹ پگلی کہیں گی-ڈرتی ہو۔"

"ہاں۔"

"کس سے؟"

"اپنے آپ سے تم سے قسمت سے اپنے سماج سے اور سب سے زیادہ پنڈت دوارکا داس سے"--!

"پنڈت دوارکا داس سے کیوں؟" راشد چونک پڑا۔

"راشد! تم اسے نہیں جانتے! تم نے اس کا اصلی روپ ابھی نہیں دیکھا۔ وہ درندہ ہے۔ درندہ جانتے ہو اس نے بملا کا گلا اپنے ہاتھوں سے گھونٹ ڈالا تھا۔"

"اوما۔" راشد نے اسے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"راشد میں تمہاری طرح بہت زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں- پر میں! میں...... سچ کہتی ہوں میرا جسم یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میری آتما سب کچھ تمہارا ہے۔ پر دیکھو اس کے اندر جو دل ہے نا! اسے ٹھیس نہ لگانا۔"

"اوما" جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے اوما کو گلے لگا لیا۔

ایسے لمحوں میں جب الفاظ کھو جاتے ہیں تو ایسی الٹی سیدھی حرکتیں ہی جذبات کا اظہار کیا کرتی ہیں۔ وہ دونوں اس طرح چپ چاپ نہ جانے کتنی دیر ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ خاموش ایک دم خاموش-! ایسے جیسے ان کے قدموں کے پاس بہتی ہوئی بھارت ندی۔ ان کی نظروں کے سامنے ننھے منے جگنو چمک رہے تھے جیسے ستارے ان کے مقدس پیار کی گواہی دینے کے لئے دھرتی پر اتر آئے ہوں۔ پورن ماشی کا چاند مسکراتا ہوا ان کے سر پر سایہ فگن ہو گیا تھا- جیسے ان سے کہہ رہا ہو۔

"میرے بچو! آؤ میرے دامن میں پناہ لے لو اور جی بھر کے ایک دوسرے کو پیار کرو۔ میری آغوش میں چلے آؤ۔ یہاں کوئی پنڈت دوارکا داس نہیں جو تمہاری مسرتوں کو ڈس لے گا۔

سینٹ میری چرچ میں لوگ دھیمے دھیمے سروں میں گا رہے تھے۔ ریورنڈر فرانسس کا وعظ ختم ہو چکا تھا۔ چرچ سے بھی آگے نکل کر اس ن کالج کی جانب جاتی

ہوئی سیاہ تارکول کی سڑک پر نظر دوڑائی جیسے کوئی نجومی کسی کے گھور اندھیرے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کرے۔ سفید کپڑوں پر سرخ سویٹر پہنے ایک لڑکی سامنے سے آرہی تھی۔ راشد کو یوں لگا جیسے تاریکی میں ستارہ آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا ہو۔ کالج کی سڑک کو چھو کر وہ دوسری سڑک پر ہو لیا جو سیدھی گومتی کے کنارے جاتی تھی۔ اس کے دونوں طرف انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا جس میں ہر طرح کے انسان تھے۔ مزدور، سرمایہ دار، لیڈر، انٹیلکچوئل، ادیب، شاعر اور نہ جانے کیا کیا۔ سڑک کے ایک طرف سائیکلوں پر سوار لڑکیوں کا ایک ہجوم سا جا رہا تھا۔ نیلے فراک اور سفید شلواروں والی لڑکیاں جنہوں نے سیاہ بالوں میں سرخ ربن باندھ رکھے تھے۔ آپس میں خوش گپیاں لڑاتی ساری کائنات سے بے پرواہ چلی جا رہی تھیں۔

وہ ان سب سے بے پرواہ گومتی کنارے بندے ہوئے گاندھی پارک میں پہنچ گیا جہاں سفید ساڑھیاں پہنے ہوئے سیاہ اور خاموش آنکھوں والی بے شمار لڑکیاں اپنے جوڑوں میں جوہی کے پھول سجائے گھوم رہی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے وہ نوجوان بھی تھے جن کے نوجوان چہروں پر امید، مایوسی، بے یقینی اور خود اعتمادی کی ملی جلی پرچھائیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ وہ بہت کچھ سوچتے تھے۔ بہت کچھ کر چکے تھے اور ابھی بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے چاروں طرف ایک بہت بڑی اندھیری دنیا پھیلی ہوئی تھی جس سے وہ اب تک لڑتے آئے تھے جس سے انہیں نہ جانے کب تک لڑتے رہنا تھا۔ ان کے درمیان انقلابی خیالات والے بھی تھے۔ اعتدال پسند اور قنوطی بھی۔! لیکن وہ ان سب سے الگ تھلگ گومتی کے منارے ساحل کے ایک طرف بیٹھ گیا جہاں اس سے ذرا ہٹ کر ایک جوڑا ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بیٹھا تھا۔ ایک لمحہ کو انہوں نے اس کھوئی کھوئی سی آنکھوں والے نوجوان کو دیکھا اور پھر اسے بے ضرر جان کر اپنی باتوں میں مگن ہوگئے۔ وہ ٹکٹکی باندھے پانی کی لہروں

کو گھور رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ بے مقصد ان لہروں کو گھورنے کے بعد واپس چلا آیا۔

ہوسٹل واپس آیا تو ماسٹر جی کے خط کے ساتھ ہی اوما کا ایک خط بھی اس کا منتظر تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"راشد بابو!

کل مجھے پرکاش نے اپنے حضور طلب کر کے سرزنش کی تھی اور مجھے اس انجام سے بھی آگاہ کیا تھا جس سے مجھے دوچار ہونا پڑے گا۔ پر تم گھبرانا نہیں وہ پاگل ہے اسے کیا معلوم میرے تو جنم کا باعث ہی تم ہو۔ میں تو جنم جنم کے ویرانوں میں تمہیں تلاش کرتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں۔ اب تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتی۔ موت ہمارے وصال کا حرفِ اول ہوگا۔ محبت کا جو شعلہ تم نے میرے دل کا معبد زندگی کے آخری لمحوں تک اس شعلے سے روشن رہے گا۔

میں تو تم سے اس طرح پیار کرتی ہوں جیسے شبنم پھولوں اور پتوں سے۔ پرکاش تو پاگل ہے۔ بھلا ندی کو اپنے کناروں اور چاند کو اپنی کرنوں سے پیار کرنے سے بھی کوئی روک سکتا ہے؟ وہ چشمہ جس نے تپتے ہوئے صحرا میں میری پیاس بجھائی تھی مجھے بھول جائے گا؟

میری محبت وہ ستارہ صبح نہیں جو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ماند پڑ جائے یہ تو ہمالہ پربت کی وہ چوٹی ہے جہاں سے بہتا ہوا پانی پانچ دریاؤں کو جنم دیتا ہے۔ نرگس کا وہ اندھا پھول ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ بس یہی سوچ سوچ کر رہ جاتی ہوں کہیں آشاؤں کے پتھریلے پہاڑوں سے ٹکراتے ٹکراتے میرا جسم ہی چور چور نہ ہو جائے۔ عورت ہوں نا!

تم کب آؤ گے؟ محمد حسین نے بتایا تھا۔ اس مہینے تم آجاؤ گے لیکن کیا کروں میں تو چاہتی ہوں تم بہت پڑھو لکھو بہت بڑے افسر بنو۔ پرکاش سے بھی بڑے تاکہ وہ ہم سے

نکرا ہی نہ سکے۔ محمد حسین بہت اچھا ہے۔ تمہارے خطوط مجھے فوراً پہنچا دیتا ہے۔ ماسٹر جی بھی بہت اچھے ہیں۔ تم سب لوگ ہی بہت اچھے ہو۔ بہت ہی پیارے۔"

میں ہوں تمہاری

اوما

خط پڑھتے وقت اس کی تمام حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آگئی تھیں۔ اس نے ایک ایک لفظ کو نہ جانے ہمیشہ کی طرح کتنی کتنی بار پڑھا تھا۔ اسے ایک ایک لفظ سے اوما کی خوشبو آ رہی تھی۔

جسے وہ اپنی زندگی سے بڑھ کر پیار کرتا تھا تاکہ وہ بہت بڑا افسر بن جائے۔ دنیا کی کوئی طاقت بڑائی اور امارت میں اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور اب تو منزل بہت ہی نزدیک آ رہی تھی۔ بس چھ ماہ بعد ہی اسے ڈگری مل جائے گی-!! پھر وہ ہوگا اور اوما۔ دنیا کتنی حسین ہو جائے گی۔

سینٹ میری کی مقدس نن کتنی خوش ہوگی۔ اس کی اس کامیابی پر۔ وہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جسے پیار کرتے ہیں۔ سسٹر مرسی فونک ماسٹر نور محمد، محمد حسین اور سب سے بڑھ کر اوما۔

"کیشو"۔ پنڈت دوارکا داس نے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے کیشو رام پر دھاڑتے ہوئے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو تمہاری حرکتیں ہم سے پوشیدہ ہیں۔"

"مہاراج! میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"بکتے ہو حرام خور۔ اور کیا تمہارے باپ نے کیا تھا۔" غصہ کے مارے دوارکا داس کے منہ سے الفاظ بھی ٹھیک طرح ادا نہیں ہو رہے تھے۔

"کیشو تم ہمارے نمک خوار ہو! اس ملیچھ کے نہیں۔ ہمارے دشمن سے تمہارا یہ میل ملاپ ہمیں ہرگز پسند نہیں ہے۔"

"مہاراج! میں نے تو......" کیشو نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس زیادہ بکواس نہ کرو۔ صرف یہ یاد رکھنا کہ وہ ماسٹر مسلا ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور اگر تم نے ہمارے خلاف کچھ سوچنے کی کوشش بھی کی تو اتنی بری سزا دوں گا کہ یاد رکھو گے......"

"لیکن مہاراج!"......

"لیکن ویکن کچھ نہیں بس دفع ہو جاؤ۔" اس نے اپنے پاؤں پڑے ہوئے کیشو رام کو لات مارتے ہوئے کہا اور وہ آنسو بھری آنکھیں پونچھتا ہوا باہر نکل آیا۔

عین اسی لمحے پردے کے پیچھے کھڑا منشی مہنگا مل بھی چپکے سے دبے پاؤں باہر نکل آیا۔ ایک سفاک مسکراہٹ اس کے بھدے ہونٹوں پر پھیل گئی جس نے اس کے چہرے پر برستی لعنت کو اور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ "گدھا نہ ہو تو کہیں کا۔ مجھے رشتہ نہیں دے گا لونڈیا کا تو اور کیا اس بوڑھے کھوسٹ سے بیاہے گا۔"

کیشو رام جب اپنی جھونپڑی میں داخل ہوا تو اوما ایک چارپائی پر گہری نیند سو رہی تھی۔ اس کے لمبے بالوں نے اس کا آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے اس کے ذہن میں رام پیاری کی تصویر ابھر آئی۔ بالکل اپنی ماں کی طرح ہے۔ جھونپڑی کے ایک کونے میں بھگوان کرشن کی مٹی کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ کیشو رام نے اچانک غصے میں آ کر اسے اٹھایا اور سامنے دیوار سے دے مارا۔

"کیا ہوا کاکا۔" اوما اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔

"کچھ نہیں بیٹا کچھ نہیں"-اس نے اوما کو اپنی آغوش میں لیتے ہوئے کہا۔

"جو بھگوان صرف برہمنوں کا ہو کر رہ گیا ہو! ہمارا اس سے کیا رشتہ۔ میری بچی۔"

"کاکا سچ بتاؤ کیا بات ہوئی ہے۔ تجھے میری جان کی قسم! کاکا سچ بتا دے آج پھر

پنڈت جی نے مارا ہے کیا--"

اور جواب میں اس کا باپو صرف آنکھیں جھکا کر رہ گیا۔ جیسے وہ خود اوما اور اوما کیشو رام ہو۔

"بھگوان کیسا انیائے (انصاف) ہے تیرا کیسا بھگوان ہے تو۔ سارے دن کی محنت کا صلہ ہمیں کیا اسی شکل میں ملا کرے گا۔ ہمارے بھاگ میں کیا یہی کچھ لکھا ہے۔"

اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے بھگوان سے پوچھا۔

اور بھگوان خاموش رہا۔

"تم نے بہت اچھا کیا کاکا! بہت اچھا کیا! بہت اچھا کیا! ہم ایسے بھگوان کو کیوں پوجیں جس کے مندر میں بھی ہمیں جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

وہ سسکیاں لیتی ہوئی اپنے کاکا سے لپٹ گئی۔

منشی مہنگا مل نے کل ہی وداھیارام کے ذریعے اپنے لئے اس کی لڑکی کا رشتہ مانگا تھا۔ لیکن کیشو رام اس حرام خور کو اپنی لڑکی بیاہنے سے اس کا گلا گھونٹ دینا۔ زیادہ بہتر خیال کرتا تھا۔

منشی اپنے شیطان مالک ہی کا چیلا تھا آخر۔

مہنگا مل کا خیال آتے ہی اس نے اچانک اپنے ذہن میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اوما کو ماسٹر نور محمد کے گھر ہمیشہ کے لئے رکھنے کا۔ وہ تو سارا دن کام پر رہتا تھا۔ بعد میں لڑکی گھر میں اکیلی رہتی تھی۔ رام جانے کس وقت اس پاپی کی نیت خراب ہو جائے اور اس کی بیٹی کا مقدر بھی وہ ذولت اور رسوائی بن جائے جس سے کئی اچھوت لڑکیاں پہلے ہی دو چار تھیں۔

"چلو بیٹی میرے ساتھ۔" اس نے اچانک اوما کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"کہاں کاکا--"؟

لیکن اس کے کچھ پوچھنے سے قبل ہی اس کا باپ اس راستے پر گامزن ہو چکا تھا جو ماسٹر نور محمد کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

"آؤ آؤ کیشو رام! آج اس وقت اچانک یہاں کیسے--؟" ہمیشہ کی طرح سرخ چہرے اور سفید داڑھی والے ماسٹر نور محمد نے اسے فراخ دلی سے ملتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں ماسٹر جی! سوچا درشن کئے کئی روز ہو گئے۔ کم بخت کم سے جان ہی نہیں چھٹتی۔ آج مہلت ملی تو چلا آیا۔"

وہ ماسٹر صاحب کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اوما کو اس نے اپنے قریب ہی بٹھا لیا تھا۔ پھر چائے بھی آ گئی۔ ایک ہی قسم کے برتنوں میں ایک ہی جگہ وہ ان کے ساتھ چائے بھی پی رہے تھے۔

کیشو رام عقیدت واحترام کے ملے جلے جذبات سے ماسٹر جی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جو سفید چشمہ لگائے اخبار پڑھ رہے تھے کتنا عظیم ہے یہ انسان!

اس کے دل سے رہ رہ کر آواز نکلتی۔

"ماسٹر جی!" بالآخر اس نے جھجکتے ہوئے بات شروع کر ہی دی۔

"ہوں"۔ ماسٹر جی بدستور اخبار پڑھے جا رہے تھے۔

"بات دراصل یہ ہے کہ......"

"ہاں ہاں کہو کہو! جھجک کیوں رہے ہو کوئی خاص بات ہے کیا۔" ماسٹر صاحب اخبار ایک طرف رکھ عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کرنے لگے۔

"اوما! جاؤ تم بیٹی اپنی خالہ کا ہاتھ بٹاؤ رسوئی میں۔" انہوں نے اوما کو وہاں سے ہٹانا چاہا۔

نجانے کیشو بھی کیوں یہی چاہتا تھا کہ اوما بھی وہاں سے ہٹ جائے۔

پھر تمام باتیں دھرانے کے بعد کیشو رام نے کہنا شروع کیا "ماسٹر جی! آپ کے پہلے بھی مجھ پر اتنے احسانات ہیں ایک احسان اور کر دیجئے۔ اوما کو اپنے ہاں رکھ لیجئے میں اسے یہاں آکر مل جایا کروں گا۔ حالات بہتر ہوتے ہی ہم یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے۔" بوڑھے اور مجبور اچھوت کا گلا رندھ گیا۔

"کیشو رام! کیسی باتیں کرتے ہو، اوما تو ہمیشہ ہی میری بیٹی بن کر رہی ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح جانا ہے۔ اس میں احسان والی کیا بات ہوئی۔ پھر اس کا اور ہے بھی کون سوائے خدا تعالیٰ کے۔۔"

"وہ ماسٹر جی!" مقہور انسان عظمت کے اس مینار کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ اس کے نزدیک اظہار عقیدت کا سب سے عظیم طریقہ یہی تھا۔ اس نے یہی کچھ جو سیکھا تھا۔

لیکن عظیم انسان نے مقہور انسان کو پاؤں سے اٹھا کر گلے لگالیا۔ کواڑوں کے پیچھے چھپی ہوئی اوما کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

عقیدت اور محبت کے آنسو۔ آنسو جو خاموش ہوتے ہوئے بھی ہزار زبانیں رکھتے ہیں اور ہر زبان ایک کہانی لئے ہوتی ہے۔

شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ نگری کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ سامنے کی پہاڑیوں کے پیچھے ڈھلتے ہوئے سورج کی کرنیں اپنی لال سرخ زبان نکالے نگری کو چاٹنے لگی تھیں۔ دھان کے کھیتوں سے تھکے ہارے کسان گردنیں جھکائے اپنی بستی کو واپس چلے آرہے تھے۔

اوما سوچ رہی تھی ابھی تک راشد نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔ رام جانے کیا معاملہ ہے؟ اس کے دل میں عجیب عجیب وسوسے بیدار ہو رہے تھے۔ پر کاش کو ان کی محبت کا علم ہو چکا تھا اور اس سے کسی بھی کمینگی کی توقع کی جاسکتی تھی۔ "کہیں خدانخواستہ اس نے......" اور اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ وہ اس سے آگے کچھ

سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہ سوچ ہی کتنی اذیت ناک ہے۔ اچانک محمد حسین اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

محمد حسین نے اپنے ہاتھ میں راشد کا خط پکڑ رکھا تھا جو وہ اسی کی معرفت بھیجا کرتا تھا۔ دھڑکتے دل سے وہ رسوئی میں بیٹھی تھوڑی دیر بعد راشد کا خط پڑھ رہی تھی جس نے لکھا تھا۔

"اوما!"

تمہیں پانے کے لئے مجھے ایک طویل ریاضت اور تپسیا سے گزرنا پڑا ہے۔ تم مجھ سے دور تو ہو سکتی ہو لیکن جدا کبھی نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں اسے میری آنکھوں سے نوچ کر جدا نہیں کیا جاسکتا۔ محبت کی دنیا کا ہر اصول نرالا ہوتا ہے۔ یہاں کی راتیں بھی دن کے سائے ہیں۔ یہاں رات کبھی نہیں آتی۔ یہ سورج ایک بار طلوع ہو جائے تو کبھی ڈوبتا نہیں ہے۔ میں ان راہوں کی خوشبو کو اپنے ذہن سے کبھی محو نہیں کر پاؤں گا جو تمہیں میری اور مجھے تمہاری طرف لے جاتی ہیں۔

اوما! جب تم نے میرے سر پر اپنی محبت کا نورانی تاج رکھا تھا اس لمحے مجھے برہم گیان ہوا تھا۔ اسی لمحے میں نے نروان حاصل کیا تھا۔ وہی نروان جس کی تلاش میں گوتم کو نہ جانے کتنا عرصہ جنگلوں کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ بادشاہت کی خوشیاں بھی اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ اب مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ زندگی کی ہر دولت نے پالی ہے۔ یہ ڈاکٹر کی ڈگری یہ زندگی میں آگے بڑھنے کی خواہش یہ سب کچھ تو تمہارے لئے ہے۔ تم جو محبت ہو میری محبت۔ محبت جو صداقت ہے۔ تمہاری محبت میرا ایمان بن چکی ہے۔ تمہارے بغیر آسمان کی نیلاہٹوں کا حسن ختم ہو جائے گا۔ ہواؤں کے طلسمی گیت کوئی نہیں سنے گئے۔ زمین کی نیرنگیاں کوئی نہیں دیکھے گا۔ تم نہ ہوگی تو حیات کی نبضیں ڈوب جائیں گی۔ رگوں میں دوڑتا جم جائے گا۔ سانسوں کا تانا بانا بکھر کر ٹوٹ جائے گا

اور تمہارے ہونے سے موت بھی زندگی بن جائے گی۔ تمہارے ہی دم سے زندگی میں ہلچل ہے۔ سرعت ہے، تڑپ ہے۔ زندگی زندہ ہے۔ یہ تم ہو جو مسکراہٹوں کو جنم دیتی ہو۔ جو چاند کی کرنوں کی طرح منزہ، پاکیزہ اور نورانی ہو۔

میں اگلے مہینے آؤں گا۔ چاہتوں کا ایک طوفان سمیٹے ہوئے جو میرے دل میں تمہارے لئے مچل مچل جاتا ہے--"

ہمیشہ کی طرح اس نے خط کو عقیدت کے انداز میں چوما جس طرح ماسٹر جی کی بیوی قرآن شریف کو چوما کرتی تھی اور اسے اپنے چھوٹے ٹرنک کے سب سے نیچے جہاں اس نے اخبار بچھا رکھا تھا۔ خطوط کی تہہ کے ساتھ رکھ کر تالا لگا دیا اور مکان کی اوپری چھت پر چلی آئی جہاں شام کے اندھیرے ناگری کو اپنے سیاہ دامن میں سمیٹنے کے لئے بڑھے چلے آرہے تھے۔ سامنے اڑتا ہوا فاختاؤں کا جوڑا فضا میں کھو گیا تھا اور قصبہ نما وادی کی پری کسی پرانی داستان کی سو سالہ نیند میں کھو گئی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے ناگری کے کھیتوں میں جنگل اگ رہے ہوں۔ اس کا سارا سبزہ خار دار جھاڑ میں بدل جائے اور اوما خود ایک پرانے قصر میں محبوس اس خار دار جھاڑ کی گہرائیوں میں گم سو سالہ نیند سو گئی ہو جیسے زندگی اور مسرت نے موت کا زہر ہلاہل پی لیا ہو۔ خوبصورتی اس سو سالہ نیند سے کب بیدار ہو گی؟ زندگی زہراب کے اس خشک چشمے سے کب ہویدا ہو گی؟ اور مسرت کس طرح اس خارزار کی ہلاکت آفرین لپیٹ سے بچ کر فضا میں پرواز کرے گی؟

یہ تھے وہ سوال جو اس کے شعور کو ڈستے چلے جارہے تھے۔ ان کی داخلی اذیت سے بیقرار ہو کر اوما کی کنپٹیوں کی رگیں تڑپنے لگی تھیں۔

رہگذر پر اب موسم خزاں اپنا زہریلا سانس اگل رہا تھا، درختوں کی ٹہنیوں سے پتے جھڑ رہے تھے۔ زرد، پژمردہ اور خشک پتے بے جان ہو کر راستے میں آپڑے تھے۔

گھاس کاٹی جارہی تھی اور زمین اس بھیڑ کی طرح ٹھٹھرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی جس کی ساری اون گڈریے نے تراش لی ہو۔ ماسٹر نور محمد کے مکان کے آنگن میں کھڑا ٹنڈ منڈ درخت خزاں پر ماتم کناں تھا۔ اوما کی بادامی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اس کی نگاہوں میں ایک دھند سی پھیلنے لگی اور اسی دھند کی سیاہی اور سفیدی میں پچھلے ہفتے کے تمام واقعات ایک ایک کر کے اجاگر ہونے لگے۔

کیشو رام کو آج آئے ہوئے تین دن ہونے کو تھے اور اوما کی چھٹی حس اسے چیخ چیخ کے کسی ہونے والے حادثے سے باخبر کر رہی تھی۔

"رام جانے کاکا کو کیا ہو گیا"-- اس نے سوچا اور شام کے دھندلکے میں اس راستے پر چل دی جو سیدھا اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔ دھان کے کھیتوں میں سے گزرتے ہوئے اچانک وہ سہم کر رک گئی۔ سامنے سے منشی مہنگا مل چلا آرہا تھاخ

"رام رام کاکا"--! اس نے منشی کو نمسکار کیا۔

"اوہ! اوما! کیسی ہو بھئی نظر آنے سے بھی رہی"-- مہنگا مل نے کھیتوں کے چاروں طرف پھیلے اندھیروں پر نظر دوڑائی۔

"کاکا! کاکا آگئے کام سے کیا؟"

نہیں وہ تو آج بہت مصروف ہیں۔ شہر سے پنڈت جی آرہے ہیں نا! گھر مین کچھ کام تھا تم ملو گی اپنے باپو سے کیا"-- ایک شیطانی مسکراہٹ مہنگا مل کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ جانے کب سے وہ اس موقع کی تلاش میں تھا۔

"کہاں ہے کاکا--؟

"ادھر قریب ہی وہ سامنے والی حویلی میں۔ آؤ چلو آؤ!"

اوما پہلے تو کچھ ہچکچائی لیکن باپ کی محبت اس ہچکچاہٹ پر غالب آگئی اور دونوں حویلی میں پہنچ گئے۔ مہنگا مل کی آنکھوں میں شہوت کی لالی اتر آئی تھی۔ وہ اوما کے شباب

کا چوری چھپے جائزہ لے رہا تھا۔ جس کے لچکیلے بدن کا ہر بل اس پر نئی قیامت ڈھا رہا تھا۔ اس کا خوبصورتی سانچے میں ڈھلا جسم مہنگا مل کے تن بدن میں آگ لگائے دے رہا تھا اور وہ شدت سے اس لمحے کا منتظر تھا جب وہ اس کا سارا شباب چوس لے۔

"وہ سامنے والے کمرے میں چلی جاؤ--" مہنگا مل نے سامنے بنے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا اور خود لاپرواہی کے انداز میں دوسری طرف مڑ گیا۔

"کہاں ہے کاکا!"--اوما نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اپنے گھر میں مر رہا ہوگا۔" اس کے پچھلی طرف دروازے سے لگا منشی مہنگا مل کھڑا تھا۔

ایک لمحے میں اوما کو سب کچھ سمجھ آ گیا۔ وہ تیزی سے مڑی۔

"کہاں جاتی ہو میری رانی"- مہنگا مل اس پر گرتے ہوئے بولا۔

"کتے کمینے حرام خور! میں تیری بیٹی ہوں۔" اس نے دو چار مکے مہنگا مل کو جما دیئے۔

"گئو ماتا کی قسم کتنی حسین ہیں یہ کلائیاں۔" اس نے اوما کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

اچانک سامنے کا دروازہ کھلا اور مہنگا مل نے گھبراہٹ میں اسے چھوڑ دیا۔ ان کے سامنے ایشر سنگھ کھڑا تھا۔

"کیا کر رہے تھے اپنی بیٹی کے ساتھ؟" اس نے منشی کو ماں کی ایک موٹی سی گالی دے کر پوچھا۔

"بھیا! یہ...... یہ، یہ...... حرامی مجھے کاکا سے ملانے لایا تھا"--اوما ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

"چپ کر جا بہن"! اشیر سنگھ نے زمین پر گرا دوپٹہ اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا اور پھر منشی مہنگا مل پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تو وہ بزدلوں کی

طرح مار کھاتا رہا اور پھر اٹھ کر بھاگ گیا۔

اوما کمرے کے ایک کونے میں دبکی پنجاب سے آئے ہوئے اس کسان زادے کو حیرت سے آہستہ آہستہ سسکیاں لیتی گھور رہی تھی جسے بھگوان نے اس کی عزت بچانے کے لئے عین موقع پر نہ جانے کیسے نازل کر دیا تھا۔

"جاؤ بہن آئندہ اس کمینے سے بچ کر رہنا۔" اس نے اپنی پگڑی کو سر پر مضبوطی سے باندھتے ہوئے کہا۔

اشیر سنگھ سردار گورمیت سنگھ کا لڑکا تھا جو ناگری ہی کا ایک زمیندار تھا۔ لیکن پنڈتوں کی طرح امیر نہیں۔ یہاں اس کے والد کو انگریز فوج کی خدمات کے سلسلے میں زمین الاٹ ہوئی تھی اور وہ سب بھائی باری باری پنجاب سے کچھ عرصہ کے لئے یہاں چلے آئے تھے۔ گورمیت سنگھ کو یہ جگہ کچھ ایسی پسند آئی کہ اس نے یہاں مستقل آباد ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے بیٹے اشیر کو بھی جس نے کاشتکاری میں گریجوایشن کی تھی اپنے پاس بلا لیا۔ باپ بیٹا مل کر زمین کاشت کرتے۔ سیدھے سادے جاٹ تھے۔ کبھی کسی معاملے میں دخل نہ دیا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ پنڈتوں نے انہیں اس لئے چھیڑنا کبھی مناسب نہ سمجھا کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ یہ سکھ ہیں اور سیاست کی بجائے ہاتھ سے زیادہ کام لیں گے۔ اس کے علاوہ انہیں مسلمانوں کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی اور عدالتوں کے چکر بھی جانتے تھے۔

آج اشیر سنگھ ایک کام کے سلسلے میں پنڈت دوارکا داس سے ملنے آیا تھا اور یہ حویلی مہمانوں کیلئے مختص تھی جہاں واپسی پر جب اسے ایک کمرے سے ایک نوجوان لڑکی کی چیخیں سنائی دیں تو اس کی مردانہ غیرت جاگ پڑی۔ اس بات سے تو وہ بخوبی آگاہ تھا کہ پنڈتوں کا یہ پرانا کھیل ہے اور اب تو یہ لہو انہوں نے اپنے نوکروں کے منہ کو بھی لگا دیا تھا۔ لیکن کم از کم اس کے لئے یہ بات ناممکن تھی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی بے

بس مظلوم کی عزت لٹ رہی ہو اور وہ خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہے۔

اشیر سنگھ، اوما کو ماسٹر صاحب کے گھر تک چھوڑ گیا تھا اور اب وہ سب سے الگ تھلگ ایک کمرے میں بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر بھگوان کو ان پر رحم کب آئے گا؟ اس کے کاکا نے اسے بتایا تھا کہ ظلم کبھی نہیں پھلتا۔ ماسٹر جی نے تعلیم دی تھی کہ ظالم زیادہ دیر تک خدا کے قہر سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن آخر بھگوان ناگری پر قہر کیوں نہیں ڈھاتا۔ کیسا بھگوان ہے یہ؟ وہ سوچتی اور آنسو بہاتی رہتی۔

"سرکار آج تو غضب ہی ہو گیا۔" منشی مہنگا مل ہانپتے ہوئے پرکاش کو سنا رہا تھا جو آج کل چھٹی پر گاؤں آیا ہوا تھا۔ "بڑی مشکل سے اس چھوکری کو منایا تھا آپ کے حضور لانے کے لئے۔ وہ تو مہاراج قابو ہی نہیں آ رہی تھی۔ آخر اسے چکر میں لا کر آپ کی خدمت میں لا رہا تھا کہ وہ حرامی سکھڑا جانے ہماری حویلی میں کہاں سے آن ٹپکا اور مجھے مارنے لگا۔" پھر وہ رونی صورت بنا کر پرکاش کو اپنے جسم پر پڑے نیل دکھانے لگا۔

پرکاش غصے سے کانپنے لگا۔ اسے غصہ اس بات پر نہیں آ رہا تھا کہ ان کے منشی کو کس نے مارا ہے بلکہ غصے کی وجہ تو یہ تھی کہ آج اوما کو اپنے بستر کی زینت بنانے کا موقع ملا تھا اور آج ہی یہ بدشگونی ہو گئی۔ جانے کب سے وہ منشی کو کہہ رہا تھا اس کے لئے۔ آج تو اس نے مہنگا مل کو بہت غصے میں باہر نکالا تھا۔ آخر کب تک صبر کر سکتا تھا۔ آج رات ہر قیمت پر وہ اسے اپنے بستر کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ پرکاش کو دیوانہ تو اس کی ایک جھلک نے کر دیا تھا۔ اس روز جب اس نے اوما کو دھان کے کھیتوں میں راشد سے ملتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو وہ اسے کئی بہانوں سے چوری چھپے دیکھ چکا تھا۔

بادامی آنکھوں والی اس اچھوت چھوکری نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی اور وہ بڑی شدت سے اس دن کا منتظر تھا کہ کب موقع ملے اور وہ اس گندمی رنگ کے لچکیلے جسم والی لڑکی کے جسم سے کھیلے اور اپنی شہوت کی بھڑکتی پیاس بجھائے۔ وہ اکثر

لڑکیوں کے ساتھ اس ظالمانہ فعل کا ارتکاب کر چکا تھا اور کوئی بھی ہفتہ یا مہینے سے زیادہ اسکے پہلو کو نہ گرما سکی۔ لیکن اوما کے متعلق تو اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ہمیشہ اس لڑکی کو اپنی داشتہ بنائے رکھے گا۔

اسے رہ رہ کر اس سکھ لونڈے پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ابھی جائے اور اس کی بوٹیاں نوچ ڈالے۔ لیکن یہ پرانا شاطر تھا۔ اسے اس بات کا بھی بخوبی علم تھا کہ یہاں معاملہ مسلمانوں یا اچھوتوں والا نہیں ہے کہ جس کو دل چاہا دبا لیا۔ یہ پنجاب کے سر پھرے جاٹ تھے۔ کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں اور پھر اشیر سنگھ کا باپ گورمیت سنگھ بھی کوئی معمولی آدمی تو تھا نہیں۔ آخر کو وہ بھی زمیندار تھا۔ یہ الگ بات کے ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ بہرحال کوئی ایسی بات تھی ضرور جو اسے کسی بھی قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا ارتکاب کرنے سے روک رہی تھی اور اسے انتقام کا کوئی راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

یہ کوئی معمولی بات تو تو نہیں۔ آج تک کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا کہ کسی برہمن زادے نے کسی اچھوت لڑکی کو اپنانا چاہا اور اس نے چوں چراں کی ہو۔ اکثر لڑکیاں تو اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر ہی قبول کر لیتی تھیں اور چپ ہو رہتیں۔

"منشی۔"

"جی مہاراج۔"

"جاؤ ہم اس سکھ کے بچے سے نمٹ لیں گے۔ اس کی یہ جرأت کہ ہمارے ملازم پر ہاتھ اٹھائے۔"

"دھنے ہو مہاراج! پرماتما آپ کا اقبال بلند کرے۔" منشی مہنگا بولا باہر آ کر اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور خود ہی مسکرا دیا۔ کس خوبی سے اس نے اپنے گلے سے بلا اتار دی تھی۔ کہیں اس کے مالک کو پتہ چل جاتا کہ وہ خود اوما کی عصمت

دری کرنا چاہتا تھا تو نہ جانے اس کا کیا حال کرتا۔ مہنگا مل نے خود کو جی ہی جی میں داد دی اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

اوما اکیلی روتی رہی--!

اس نے کسی کو کچھ نہ بتایا اور بتاتی بھی کس کو، اپنے باپو کو جو پہلے ہی نہ جانے اتنے ظلم سہہ کر کس طرح زندہ تھا۔ ماسٹر جی کو جنہوں نے پہلے ہی کتنے روگ پال رکھے تھے- محمد حسین کو جس کے اپنے دکھ ہی سمیٹتے نہ سمٹتے تھے اور اس سنسار میں اس کا تھا بھی کون۔ بھگوان! لیکن اپنے بھگوان پر سے تو اس کا ایمان کبھی کا اٹھ چکا تھا۔ اس کا بھگوان اگر کسی قابل ہوتا تو نوبت یہاں تک پہنچتی کیسے۔ کبھی کا سب کچھ ختم نہ ہو گیا ہوتا۔

اپنو بالم پردیسواری سجنی جیار ادھڑت نہ ہی دھیر
تال میں چمکت چال مچھریا
رن چمکے تلوار
سبھا میں چمکیں پی کی پگڑیا
ماتھے پہ بندیا ہمار۔
اپنو بالم پردیسواری سجن جیار ادھڑت نہ ہی دھیر

ساتھ والے مکان سے رنگو مل کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہارمونیم کے سر اس کے من پر آری سی چلا رہے تھے۔ جانے کس کرموں جلی کا بالم پردیسوا چلا گیا تھا اور اس نے یہ فریاد کی تھی۔ اس کا بالم بھی تو پردیسی ہی بن کر رہ گیا تھا اس کے لئے۔ کانپور کتنی دور تھا۔ وہاں سے صرف چالیس میل لیکن یہ چالیس میل کا سفر بھی چالیس صدیوں کی مسافت بن کر رہ گیا تھا اس کے لئے۔ آج اسے راشد بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔ آج اگر راشد یہاں ہوتا تو کم از کم وہ اس کے سامنے اپنا دل تو کھول کر رکھ دیتی۔

اس روز شام کے بڑھتے ہوئے سایوں میں راشد نے گومتی کے کنارے بنے

ہوئے باغ کے مشرقی ٹیلے پر جہاں سے سیدھی سڑک ناگری کو جاتی تھی۔ بیٹھے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے وہ آج اکیلا نہیں ہے جیسے اوما اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ وہ اس کے مدھم شہد آگئیں سانس کو اب بھی اپنے ماتھے پر محسوس کر رہا تھا۔ اس کی حنائی انگلیوں کے لمس سے اس کے دل کے ویرانے میں گلاب کے لاتعداد پھول کھل رہے تھے۔ یہ مہکتی ہوئی فضا، یہ گومتی کا ترنم خیز پانی، یہ یوکلپٹس کے خمار آگیں پھول اوما کی سحر انگیز ہنسی کی لے پر کانپ رہے تھے۔ ترناری کے لاکھوں سپید سپید پھول اس بیل سے اڑ اڑ کر آسمان کی طرف جا رہے تھے اور انہوں نے رات کے سیاہ جوڑے میں ایک تاروں بھری کہکشاں بنا ڈالی تھی۔ کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کے کونے کونے میں- روح کے گوشے گوشے میں وہ آج اوما کے لطیف لمس کا احساس کر رہا تھا اور اس کا دل کسی نامعلوم خوف، کسی نامعلوم خوشی، کسی نامعلوم حسن کے احساس سے لرزنے لگا۔

اوما جو رعونت تھی۔ نغمہ تھی۔

جب وہ اپنی سیدھی مانگ نکال کر اپنے لمبے سیاہ اور سیدھے بالوں کو پیچھے کو سمیٹ لیتی تھی تو وہ ڈچ فنکاروں کی تخلیق بن جاتی تھی۔ وہ ایسا کردار تھی جو اماوس کی پراسرار کالی راتوں میں دنیا کی گونج اور دھمک کے ساتھ یک بیک جاگ پڑے جس کے نقوش سارناتھ کی دیواروں پر کندہ تھے۔ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے جلتی ہوئی لو جس کی سرخ پرچھائیاں آنکھوں میں گھستی چلی جاتی ہوں۔ وہ سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

کالج روڈ سے گاندھی چوک اور وہاں سے رنگا کھلی- "کائی چو" نہیں۔ "تاج محل" نہیں تو پھر کہاں مرو گے؟"--"مے فیر"--!

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ رنبیر "مے فیر" ہی جائے گا کیونکہ ڈمپل وہیں اسے نظر آئے گی۔ امریکن کار کی پچھلی بتیوں جیسا چشمہ لگانے والی ڈمپل، جسے رنبیر سے صرف اتنی دلچسپی تھی کہ وہ اس کی تصویر بڑے آرٹسٹک انداز سے بناتا تھا-اور بس!

" مے فیر" میں بن جانسن کا وہ پرانا نغمہ "سیلیا سے" جو وہ جانے کتنی مرتبہ کالج میں سن چکا تھا۔ بج رہا تھا۔

" میرے لئے پیالے میں صرف ایک پیار چھوڑ دو اور مجھے شراب کی ضرورت نہ رہے گی۔" روح کی گہرائیوں میں سے پیدا ہونے والی تشنگی جس کے لئے کسی آسمانی الوہی مے کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر مجھے اس کے مقدس خداؤں کا امرت بھی ملے تو میں اس ایک پیالے کو اس سے تبدیل نہ کروں گا۔"

ریکارڈ ختم ہو گیا۔ تال کے ساتھ ساتھ فرش پر ادھر سے ادھر تھرکتے اور اس نغمے کے ساتھ آواز ملا کر آہستہ آہستہ گنگناتے جوڑے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

کافی کے دو پیالے تھامے وہ دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے اس مرتی مارتی لڑتی جھگڑتی اور شور مچاتی ہوئی دنیا میں خود کو تنہا محسوس کر رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے کچھ محسوس کر رہے تھے۔ غالباً محبت، ہمدردی، ذہنی رفاقت اور نہ جانے کیا کیا؟ رنبیر کافی کی پیالی میں چمچہ بجانے لگا اور راشد نے قریب پڑا "آؤٹ لک" کا تازہ پرچہ اٹھا لیا اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔

" یہ فلاں شخصیت کا کارٹون ہے۔ یہ مس فلاں کا پورٹریٹ ہے۔ فلاں کی عزت فلاں نے لوٹ لی۔ فلاں پارٹی کے لیڈروں کا گروپ فوٹو۔ گاندھی جی کا ایڈیشن۔ احمق شکل کے حرام خور اور ان کی خوبصورت دلہنوں کی تصویریں۔ یہ بیچارے لوگ-- یہ بیچاری دنیا۔ یہ بیچاری زندگی!

اس نے پرچہ دوبارہ میز پر رکھ کر سگریٹ سلگا لیا صرف ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا۔

اس وقت میرے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میرے پیچھے کوئی ماضی نہیں۔ احساس ہے تو صرف اس بات کا کہ وادیوں میں بہار کے پہلے سفید پھول کھل رہے ہیں

اور بارش کی بوندیں اپنی جلترنگ سنا رہی ہیں۔ آؤ ہم حسب اس طرح چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ یہ رات کبھی ختم نہ ہو گی۔ پھولوں کی خوشبو ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ مجھے اس لمحے سب کچھ بھول جانے دو۔ بھول جانے دو کہ اس تھکے ہارے جیون میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی بڑی پشیمانیاں ہیں۔ جنم جنم کے کبھی نہ بہہ سکنے والے آنسو ہیں--

اگلے روز وہ ناگری چلا آیا--!

ندی کے کنارے کنارے وہ دھان کے کھیتوں میں سے گزرتا ہوا اس راستے کی طرف چل دیا جہاں بڑے بڑے درختوں کی اوٹ میں دھر مسالہ تھا جہاں ایک اونچے مندر کی چوٹی کے نیچے باہر چند پتھر کی مورتیاں ایک بڑے درخت کے نیچے پوجا کو رکھی ہوئی تھیں۔

دھر مسالہ کے دوسری طرف پھلوں کے باغات میں بستی کے اچھوت مرد و عورتیں کام کر رہے تھے۔ جن کے چہروں پر پوشیدہ حسرتیں اور نا آسودہ آرزوئیں مچل رہی تھیں۔ ان میں بہادری بھی تھی، مضبوطی بھی اور ڈر اور خوف بھی تھا۔ اس نے ان سب کے چہرے پر ایک نہایت ہی حسین خواب کا پرتو دیکھا جس نے ان سب کو الگ الگ صورتیں ہوتے ہوئے بھی ایسے کر دیا تھا جیسے وہ سب ایک ہی دھرتی کے بیٹے ہوں۔ ایسا ہی حسین خواب اس نے بھی ایک بار دیکھا تھا۔ آج سے کئی سال پہلے جب اوما اور وہ بہت چھوٹے چھوٹے تھے ایک دم بچے--!!

اس نے سوچا تھا وہ پڑھ لکھ کر بہت بڑا ڈاکٹر بنے گا اور ایک روز اوما کو بیاہ کر لے جائے گا۔ اور آج اس کا خواب شرمندہ تعبیر ہونے میں مدت ہی کتنی رہ گئی تھی۔ صرف سات دن ہاں صرف سات دن ہی تو تھے۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹر ہوتا-- اور پھر تمام سنہرے سپنے ایک ایک کر کے حقیقت کا روپ دھار لیتے--!! اس نے سوچا انسان کتنا عظیم ہے!

جو پہلے اس خواب کو کتاب کے ایک ورق پر، تصویر کی ایک جھلک میں، سپنے کے کسی افق پر جھلملاتے دیکھتا ہے- اور پھر اپنی زندگی کی ساری کاوشوں سے اس سنہرے خواب کو دھرتی پر تعبیر کرنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ تاج محل وجود میں آجاتا ہے- ایفل ٹاور بن جاتا ہے نیپر کا بند کھڑا ہو جاتا ہے اور کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے لگتے ہیں۔ ندی نالوں کے رخ، پہاڑوں کے گوشے، ہواؤں کے مزاج بدل جاتے ہیں۔ انسانوں کی محنت سے اک نیا جہان اور اک نیا سماج جنم لیتا ہے۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے سب سے پہلے اوما کو دیکھا۔ ہاں یہ وہی تھی جس کے لمبے سیدھے سیاہ بال اور بادامی آنکھیں کسی ڈچ فنکار کی تخلیق تھیں- جس کا میڈونا کا سا ارمنی چہرہ تھا۔ جسے دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کہیں آگ بھڑک اٹھی ہے یا کہیں سارناتھ کے اندھیرے مندر میں تیز سرخ، روشن، جاندار اور مخملیں گلاب جگمگا رہے ہیں۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ ہی اتنے سرخ رہتے تھے۔

یہ وہ تھی جو اپنی الف لیلوی دنیا کے محرابوں سے نکل کر دفعتاً زندگی میں اس کے سامنے آگئی تھی۔ اس دنیا میں سے جس کی داستانیں گومتی کنارے جامنوں کے سائے میں بندھی ہوئی کشتیوں میں بیٹھے بوڑھے ملاح آج بھی اجنبی مسافروں کو سنایا کرتے ہیں- وہ تو اسے جانتا تھا- ازل سے- ان آنکھوں کی گہرائیوں کو پہچانتا تھا جو کہتی تھیں- ہم تو کائنات و ہستی کے سارے اسرار جانتی ہیں۔

"اوما" اس نے کھڑکی سے باہر کی سمت دیکھتی ہوئی اوما کے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا۔

"راشد بابو!"

اور وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔ اس کے تمام بدن پر کپکپاہٹ طاری تھی، یوں

معلوم ہوتا تھا جیسے اسے سرسام ہو گیا ہو--!

"اوما! کیا بات ہے! کیا ہو گیا تمہیں۔" اس نے اوما کو سیدھا کرتے ہوئے بچوں کی طرح پوچھا۔

اوما کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو بے اختیار جاری ہو گئے۔ وہ اس کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔ وہ اس طرح اس سے پہلے کبھی نہیں روئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے سینے میں، اس کے دل میں، اس کی روح کی گہرائیوں میں سال ہا سال تک یہ آنسو منجمد ہوتے رہے تھے۔ اک برف کی سل بن کر اس کی شخصیت کی تہوں میں سما گئے تھے اور بہہ نہ سکے۔

لیکن آج۔ آج تو جیسے وہ برسوں کی برف وہ صدیوں کے منجمد آنسو، برق تپاں کے لمس سے اس کے سینے میں، اس کے دل میں، اس کی روح کی پہنائیوں میں پگھلے جا رہے تھے اور وہ اپنے محبوب کے سینے سے لگی سسک رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ اس نے اپنی مسکراہٹ بیکار سمجھ کر ہمیشہ کے لئے اتار پھینکی تھی اور اپنی غریب اور بے کس زخمی زندگی کو اپنے محبوب کے سامنے ننگا کر دیا تھا۔

"کیا ہوا اوما۔" راشد نے حیرانگی اور دکھ سے پوچھا۔

لیکن اوما روتی رہی۔ اس نے اسے کچھ نہ بتایا۔ راشد نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ آخر اوما کے آنسو تھمے اور اس نے آہستہ آہستہ رک رک کر سسکیوں کے درمیان پچھلے تمام واقعات بیان کر دیئے۔

جب وہ اپنی حکایت غم سنا رہی تھی تو راشد کی حسیات بدل رہی تھیں جیسے کسی غیر معمولی کیمیائی عمل نے زندگی کی ساری مسرتوں کو جلا کر راکھ کر دیا ہو۔ اس راکھ کا ذائقہ وہ نہ صرف اپنی زبان پر ہی محسوس کر رہا تھا بلکہ اس کی نظر میں بھی اب اسے ہر چیز بدلی نظر آ رہی تھی۔ "ناگری" کی کھلی ہوئی دھوپ اسے یوں لگتی جیسے کسی نے ننگے

جسم پر بھبھوت مل دیا ہو۔ بلبل کے شیریں نغمے کو جیسے کسی نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ جیسے کسی نے آنکھوں۔ کانوں، خون، دل اور روح کے گوشے گوشے میں راکھ جھونک دی ہو اور وہ نہ کچھ پرکھ سکتا تھا نہ ہی کچھ سن سکتا تھا۔

اس حکایت خونچکاں کے اختتام پر اس کی آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ ہو گئیں۔ یوں جیسے وہ آنکھیں ابھی لہو رو دیں گی---اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں آہستہ سے بند کر لیں اور اوما کو اپنے سینے سے لگا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"چند دنوں کی بات ہے اوما! صرف چند دنوں کی۔ جیسے تیسے بھی صرف چند دن جی لو---اس کے بعد یہ پنڈت تو کیا ان کا بھگوان بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

اس لمحے جب وہ دونوں الگ ہو رہے تھے کواڑوں کے پیچھے لال چہرے اور سفید ڈاڑھی والا ماسٹر نور محمد کپکپا کر رہ گیا۔

"خدایا! یہ سب کیا ہو گیا ہے! کیا تاریخ ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرائے گی۔"!

ان کی آنکھوں میں اپنے بچپن کا وہ واقعہ گھوم گیا جب ایک برہمن لڑکی ایک نوجوان مسلمان کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور برہمنوں نے مسلمانوں کی تمام بستی پھونک ڈالی تھی۔ پھر یہ فساد سارے شہر میں پھیل گیا تھا- سات دن تک گولیاں چلتی رہیں تھیں۔ فساد ہوتا رہا تھا۔

ہر طرف آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ براہمن ایک ایک مسلمان بچے کو قتل کر دینے پر تلے ہوئے تھے۔ بڑی مشکل سے گورا فوج کی ایک پلٹن نے آکر قابو پایا تھا۔ قصبے بھر میں نہ جانے کتنے معصوم اس محبت کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔

کیا پھر وہی فساد، وہی لوگ وہی خون۔ "نہیں نہیں! کم از کم میری زندگی میں تو یہ ناممکن ہے۔" انہوں نے زیر لب دہرایا اور باہر چلے آئے۔

اوما سے ماسٹر صاحب کو اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیار تھا ان کے لئے یہ ناممکن تھا

کہ اسے خود سے الگ کر دیتے۔ ان کے دل میں فوراً یہ خیال آیا تھا کہ کشور رام کو اس کی امانت سونپ دی جائے اور اب وہ اس سے صاف صاف کہہ ڈالیں کہ وہ امانت کا یہ بار اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔

لیکن اس غریب کا آخر ہے کون؟

پھر اوما کا کیا بنے گا؟

براہمنوں سے اس کی عزت کیسے بچے گی؟ اور اگر ان دونوں نے ایک ہونے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو کیا وہ انہیں اس ارادے سے باز رکھ سکتے ہیں؟

یہ تھے وہ سوالات جو رہ رہ کر اس بوڑھے آدمی کو پریشان کئے دے رہے تھے-!

"مولا! تو ہی رہنمائی فرما--"

جب کوئی بھی راستہ نظر نہ آیا تو انہوں نے خدا پر ہی ڈوری چھوڑ دی۔

"اوما! بس ایک ہفتہ بعد مجھے ڈگری مل جائے گی- پھر ہم شادی کر لیں گے۔ سسٹر مرسی فوک کی بہن دہلی میں بہت بڑی افسر ہے وہ مجھے وہیں ملازمت دلا دے گی- اتنے بڑے شہر میں کس کو ضرورت ہو گی کہ ہمیں جانتا پھرے۔ بس وہیں اپنی ننھی سی الگ تھلگ دنیا بسا لیں گے پھر تمہارے باپو کو بھی ایک روز منا کر ساتھ لے جاؤں گا۔"

بظاہر تو یہ بڑی معمولی سی باتیں تھیں لیکن ان کی سنگینی کا احساس اوما کو خوب تھا۔ وہ جانتی تھی براہمنوں کی اس نگری سے اتنا سا سکھ مانگنے کی کیا قیمت دینی پڑے گی۔

لیکن اس لمحے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان حسین لمحوں کو ایسی ناخوشگوار سوچوں کی نذر کرنے کی روادار نہیں تھی۔ اسے یہی چند لمحے تو زندگی کی اکمل ترین رعنائیوں کا احساس دلایا کرتے تھے۔ ورنہ دن رات اس کے ننھے سے معصوم دل پر یہی ناگوار سوچیں سوار رہا کرتی تھیں۔ زندگی لق ودق ہو تو سراب ہی سب کچھ ہو جاتے ہیں۔

دونوں مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھوئے رہے اور رات چپ چاپ اپنا دامن

سمٹتی رہی۔

دھر مسالہ کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کو سامنے آتے ہوئے منشی مہنگا مل اور پرکاش نے دیکھ لیا تھا لیکن وہ ان دونوں سے بے خبر ایشر سنگھ کے کنوئیں کی طرف اس سے ملنے جا رہا تھا۔

"یہی ہے مہاراج وہ ملیچھ جس نے جانے چھوکری پر کیا جادو کر رکھا ہے کہ ہر سمے اسی کے گن گایا کرتی ہے۔"

"حرامی" پرکاش نے زیر لب راشد کو دو تین گالیاں بکیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اس کا جی چاہتا تھا کہ اس ملیچھ کا گلہ گھونٹ دے۔

"بلاؤ اسے۔" اس نے منشی کو حکم دیا اور خود ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے بلانے سے قبل ہی وہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"کیا بات ہے پنڈت جی۔" راشد نے تمسخرانہ انداز میں پوچھا۔ اور براہمن کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"تم جانتے ہو تم کیا کر رہے ہو۔" قہر کا دیوتا پھنکارا جیسے اسے بھسم ہی کر ڈالے گا۔

"جانتا ہوں۔" اطمینان اور سکون سے جواب دیا گیا۔

"اس کا انجام بھی جانتے ہو۔" دھمکی آمیز لہجے میں اسے انجام کا احساس دلایا گیا جیسے اب تک وہ بے خبری ہی میں مبتلا تھا۔

"جانتا ہوں۔" لہجے کا سکون بدستور برقرار تھا۔

"تمہیں کیا حق ہے ہمارے گاؤں کی ایک لڑکی کو خراب کرتے پھرو؟" غصے سے پھنکارتے ہوئے پوچھا گیا۔

"آپ کو مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے کا حق کس نے دیا۔" ترکی بہ ترکی جواب ملا۔

"پنڈت جی! یہ مت بھولئے معاشرے میں میرا بھی ایک مقام ہے۔ میں کوئی گرا

پڑا اچھوت نہیں جو آپ کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاؤں گا۔ میں نے اوما سے محبت کی ہے اور زندگی کے آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔ آپ تو کیا آپ کا سارا سماج بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ نہ اخلاقی جرم ہے نہ قانونی۔ مجھ پر تعزیرات ہند کی کوئی دفعہ لاگو نہیں ہوتی۔ رہی آپ کے دھرم کی بات تو آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کا دھرم کیا ہے؟ آپ ایک لڑکی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لئے اپنے آباؤ اجداد کی صدیوں پرانی گندی اور بے ہودہ رسم کو توڑ کر ایک اچھوت لڑکی کو اپنے دھرم کا حصہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس کے متعلق اپنے پورانوں کا حکم آپ خود جانتے ہیں۔ ان بیچاروں کا تو آپ کے بھگوان کی عبادت کرنے کا بھی حق حاصل نہیں۔ ان کا مذہب سوائے آپ کی غلامی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اوما، آزاد دیش کی آزاد لڑکی ہے۔ اسے ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ اپنی زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکے۔ وہ کوئی دودھ پیتی بچی تو ہے نہیں۔ اور نہ ہی آپ کی بہن ہے کہ آپ اس کی فکر کرتے پھریں۔"

اس کا لہجہ اشتعال انگیز ہو گیا تھا۔ نفرت کا وہ لاوا جو اس کے سینے میں ان وحشیوں کے خلاف نہ جانے کتنی دیر سے پک رہا تھا آج آتش فشاں بن کر پھٹ جانا چاہتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا اس ذلیل براہمن کا گلہ گھونٹ دے جو اس کی اوما پر اپنا حق صرف اس لئے جتا رہا تھا کہ اس کا باپ اس کا ملازم تھا۔ صدیوں سے وہ ان غریبوں کے ان داتا بنے بیٹھے تھے۔

"شٹ اپ-" پرکاش آخری فقرے پر چیخ اٹھا۔ "کتے کمینے ذلیل" وہ غصے سے ہانپنے لگا۔ "تمہیں اس گستاخی کی ایسی سزا ملے گی کہ آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔" وہ غصے سے سر پٹختا چلا گیا۔

"کیشو رام"- پرکاش نے اپنے سامنے کھڑے کیشو کو گھورتے ہوئے کہا۔

"مہاراج"-- کیشو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے جسے اس کے حکم پر حاضر کیا گیا تھا۔

"اپنی لونڈی کو لگام دو وہ اس ملیچھ چھوکرے سے رنگ رلیاں مناتی پھرتی ہے ہم گاؤں کی عزت مٹی میں ملتی نہیں دیکھ سکتے۔"

کیشو رام کانپ کر رہ گیا۔ اس کی لڑکی کی عصمت پر الزام لگایا جا رہا تھا۔ اس کے سارے جسم میں چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ براہمن زادے کا گلہ اتنی زور سے دبائے کہ اس کی آنکھیں پھٹ جائیں اس کی زبان کو کاٹ کر باہر پھینک دے۔

لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ چپ چاپ باہر چلا آیا۔ اس کا جی بھر آیا تھا۔ اپنی اس بے عزتی پر وہ چیخ چیخ کر لوگوں کو سب کچھ بتا دینا چاہتا تھا کہ کس طرح اس ذلیل براہمن نے اس کی شبنم کے مقدس قطرے کی طرح پاکیزہ لڑکی پر الزام تراشی کی ہے۔ پر وہ بتائے کس کو؟ کس کے سامنے فریاد کرے؟

اس کی بے بسی آنسوؤں کے راستے اس کی آنکھوں سے بہہ نکلی۔

کیشو رام سیدھا ماسٹر صاحب کے گھر آیا تھا! اوما نے رو رو کر برا حال کیا ہوا تھا۔

"کاکا! رام قسم میں بالکل پاک ہوں۔ ان چھوئی کلی کی طرح۔ اگر محبت کرنا پاپ ہے تو لوگ بھگوان سے کیوں محبت کرتے ہیں۔ میں نے پیار ضرور کیا ہے۔ لیکن تیری عزت پر حرف نہیں آنے دیا اور نہ کبھی جیتے جی آنے دوں گی۔ کاکا! تو میرا گلہ گھونٹ دے۔ مجھے جان سے مار دے پر بھگوان کے لئے اس کمینے پنڈت کی بات کا یقین نہ کر وہ حرامی تو تیری عزت سے کھیلنا چاہتا ہے۔ کاکا! تو مجھے مار ڈال لیکن یہ نہ کہنا کہ راشد کو بھول جاؤں۔"

"چپ کر جا میری بیٹی۔ بس چپ کر جا۔" کیشو رام نے رام پیاری کی نشانی کو خود سے چمٹا گیا وہ تو اس کے معمولی دکھ پر تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے تو کبھی اپنی بیٹی سے پینے کو پانی نہیں مانگا ھتا۔ وہ اس سے اتنی بڑی قربانی کیسے مانگے۔ اسے کیسے کہے کہ راشد کو بھول جا۔ راشد اس کی کوئی بھول تو نہیں تھی وہ تو اس کی بیٹی کی محبت تھا! محبت چٹان

جیسا مضبوط جذبہ جو سارے سنسار سے ٹکرا جانے پر تلا ہوا تھا۔

کیشو رام نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا۔ اپنی ساری زندگی کی کمائی راشد کو سونپ دینے کا۔ وہ اپنے اس فیصلے کے انجام سے بخوبی آگاہ تھا جو سوائے موت کے اور کچھ نہیں تھا۔ براہمنوں کو چھوڑ خود اس کے اپنے بھائی بندھی اسے مار ڈالتے۔ ان کے دھرم کی اس طرح بے عزتی کی جائے وہ کبھی برداشت نہ کر پائیں گے۔ لیکن وہ تو ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ رام پیاری کے سامنے شرمسار نہ ہو۔ وہ رام پیاری کی اس انمول نشانی کا دل توڑ کر بھی کب زندہ رہ سکتا تھا۔

"ہم تو سیدھے سادے جاٹ ہیں بھیا جسے زبان سے بھائی کہہ دیں اس کے لئے سب کچھ تیاگ دیتے ہیں۔ یہی ہمارے دھن گورو کا اپدیش ہے۔ اوما کو اس روز بہن کہا تھا اور تمہیں آج بھائی۔ جاؤ میرے جیتے جی! فکر سے آزاد ہو جاؤ۔ طاقت سے تو یہ پنڈت تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور سیاست کی مار سے تمہیں وگورو سچا بادشاہ آپ بچا لے گا۔" اشیر سنگھ بولا۔

"بھیا!" راشد عقیدت و محبت سے رندھی ہوئی آواز میں اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ جب الفاظ کھو جائیں تو آنسو ہی زبان بن جایا کرتے ہیں۔ بس اس کی آنکھیں فرط عقیدت و محبت سے چھلک پڑیں۔

وہ اشیر سنگھ کے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا اور کافی دیر تک دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے، پھر اشیر سنگھ نے اسے تسلی دلا کر واپس بھیج دیا۔

اس رات!

دو بوڑھے انسان دو نوجوان دلوں کو جوڑنے کا عہد کر رہے تھے۔ جس کام کا بیڑا انہوں نے اٹھایا تھا وہ بظاہر آسان نظر آ رہا تھا لیکن اس کی سنگینی سے دونوں بخوبی آگاہ تھے۔

"ماسٹر جی کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر مجھ ناچیز پر یہ آخری احسان بھی کر ڈالئے۔ اس

کے بعد آپ کو کبھی تنگ نہ کروں گا۔" کیشو رام نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

اسی رات دوسری طرف پنڈت دوارکا دس کے گھر بھی محفل جمی ہوئی تھی وہاں لگ بھگ پچیس تیس "معزز براہمن" جمع تھے جنہیں پنڈت دوارکا دس نے ایک ضروری معاملے پر بات چیت کے لئے مدعو کیا تھا۔ ان میں لالہ بساکھی رام، بانشی رام، ست پرکاش، مہیش چند، حکم چند، دیپک رائے، سنتوش بھاٹیہ، سالگ رام، کونڈومل وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ یہ لوگ اپنی سانولی بلکہ اکثر حالتوں میں کالی رنگ۔ مکار قسم کی لمبی ناک اور مسکین لہجے سے بخوبی پہچانے جاتے تھے۔ آواز ریشم کی طرح ملائم، لیکن ہر فقرہ ذو معنی دو دھاری تلوار جو دونوں اطراف سے کاٹ کرے۔ ان سب کے آپس کے ذہنی توازن نے ہی تو ان حرامیوں کو اتنا امیر بنا ڈالا تھا کہ یہ لوگ اپنی قومی خصوصیت کسی حال میں بھی چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے تھے۔ ان سب کے سر پر پگڑیاں مڑھی ہوئی تھیں اور بھدے ہاتھوں کی انگلیاں سونے کی بیش قیمت لال رنگ کے نگینوں والی انگوٹھیوں سے آراستہ تھیں۔ ایک دو کے پاس سونے کی بیش قیمت جیسی گھڑیاں بھی تھیں جن کے ساتھ سونے کی زنجیر بھی لٹک رہی تھی اور وہ بار بار انہیں وقت دیکھنے کے بہانے نکال رہے تھے۔ گھڑیوں کے علاوہ اکثر کو ان کی موٹی توندوں نے بھی دوسروں سے ممتاز کر رکھا تھا۔

چند نمائندے سناتن دھرمی سکھوں کے بھی تھے جو بے پیندے کے لوٹے کی طرح ہوا کا رخ دیکھ کر پھر جایا کرتے تھے۔ گردوارے میں واہگورو واہگورو کر لیا اور مندر میں شوجی کو پوج لیا۔ سردار نرمل سنگھ، پرتاب سنگھ وغیرہ ان میں نمایاں تھے۔ ناگری کے ساتھ ہی واقع موضع چوپاٹی سے بھی کچھ لوگ آئے تھے۔ پنڈت وساکھی رام، وشوامتر وغیرہ آج حجامت بنوا کر نئی قمیصیں پہنے ماتھے پر چندر اور تلک لگا اور گلے میں مالا ڈالے آلتی پالتی مارے سامنے براجمان تھے۔

دراصل یہ سب مہاجن تھے یا بہت بڑے بڑے زمیندار دمرم شاستروں کو خاک بھی نہ سمجھ پاتے تھے چونکہ صدیوں سے براہمن چلے آ رہے تھے۔ لہٰذا اپنی اسی پنڈتائی کو برقرار رکھنے کے لئے اس محفل میں بڑے متین اور بزرگ صورت بنے بیٹھے تھے۔ پر چہرہ جو دل کا آئینہ ہے صاف ظاہر کرتا تھا کہ یہ نرے چغد ہیں اس معاملے میں۔ وہ بار بار بے چین ہو کر پہلو بدل رہے تھے۔ کبھی آپس میں کھسر پھسر کرنے لگتے یا کبھی کبھی آنکھیں بند کر کے کوئی انٹ شنٹ اشلوک گنگنانے لگتے تاکہ دوسروں پر رعب طاری کر سکیں۔ مذہبی سماج کی روایت پرستی اور جاہلیت اس مجلس میں پورے طور پر عیاں تھی۔

دوارکا س کا لڑکا پنڈت اوم پرکاش آئی۔ سی۔ ایس اپنی تمام افسری بھول بھلا کر ماتھے پر تلک لگائے اور لنگی پہنے ادھر ادھر گھسٹتا انہیں پانی شربت وغیرہ پلاتا پھر رہا تھا۔ اس کی کھوکھلی اور کھسیانی ہنسی بار بار سنائی دے رہی تھی۔

"پنڈت رام سروپ جی ابھی نہیں آئے۔" لالہ وساکھی رام نے اپنی طلائی گھڑی غالباً دسویں بار جیب سے باہر نکال کر دوارکا داس سے پوچھا تھا۔

"اوپر ذرا دھیان گیان میں مگن ہیں۔ پوجا کر رہے ہیں۔ بس ابھی آئے"۔ اور اس کی بتیسی باہر نکل آئی۔ اس کے سامنے کے دانت ایسے نظر آ رہے تھے جس طرح ہندو مصور اپنی دیومالائی کی تصویریں کھینچتے وقت راکھششوں کے دکھایا کرتے ہیں۔

عین اس لمحے پنڈت رام سروپ جی اندر داخل ہو گئے۔ سب لوگوں نے اسے نمسکار کیا اور کمرہ "پالاگن مہاراج"، "پالاگن مہاراج" کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ پنڈت جی مسکرائے ان کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ باوقار انداز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ اپنی مسند پر براجمان ہو گئے جہاں گاؤ تکیہ ان کا منتظر تھا۔ ساری مجلس خاموش ہو گئی۔ پنڈت جی کے نزدیک ایک چوکی پر "یوگ واشسٹ" پڑا تھا اور دوسری پر ایک پیتل کے تھال میں گھی کا دیا روشن تھا۔ دھوف بھی سلگائی گئی جس کا معطر دھواں کمرے کی فضا

میں گھٹن سی پیدا کرتا چاروں طرف چکر کاٹتا پھر رہا تھا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔

"مترو! آج میں نے آپ کو ایک بہت ہی کٹھن بات پر وچار (سوچ) کرنے کو بلایا ہے۔ کئی دنوں سے میں اس وشے (معاملے) پر سوچ رہا ہوں۔ من میں سو طرح کے وچار آتے ہیں۔ دھرم اور دنی کی لڑائی ہے۔ سوچتا تھا آپ کو بلاؤں یا نہ بلاؤں۔ کل رات "سوسی واچن" کر کے "یوگ واشسٹ" کا پاٹھ کیا تو یہ منتر آیا۔"

پنڈت جی نے وہ منتر پڑھ ڈالا۔ کسی کے پلے خاک بھی نہ پڑا۔ لیکن سبھی "ہرے اوم، ہرے اوم" کی رٹ لگانے لگے۔

"ہے بھگوان تیری لیلا اپرم اپار ہے۔" لالہ وساکھی رام نے اپنی پنڈتائی جتانی چاہی۔

"مہاراج! یوگ واشسٹ کا کیا کہنا جو کوئی اس کا پٹھن پاٹھن کرے اس کا "چتوں یوگ" میں بھلا ہی بھلا ہے"! سالگ رام نے سوچا میں کیوں چپ رہوں۔"

پنڈت جی مسکرائے۔ اس کا منتر کا ارتھ ہے کہ "زندگی دو گھڑی کا میلہ ہے۔" اور اپنی کانی آنکھ سے بہتے پانی کو انگھرچھے سے پونچھنے لگے۔

"لیکن سجنو! اس کا ارتھ یہ بھی ہے کہ اپنے دھرم سے غافل نہ بنو۔ اسی سے مکتی پراپت ہوتی ہے۔"

"سیتہ ہے مہاراج۔" لالہ کونڈو رام نے دہائی دی۔

"ست بچن مہاراج۔" سردار نرمل سنگھ ابھی تک خاموش تھا۔

"آپ کی بانی میں تو امرت ہی امرت گھلا ہے مہاراج۔" پرتاب سنگھ بولا پھر وہ اپنی کوچی نما ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر خاموش ہو گیا۔

"سجنو! آپ سب کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ "پنڈت رام سروپ نے ان کی بکواس سے جان چھڑانی چاہی۔ پھر اس نے خوب مرچ مصالحہ لگا کر اوما اور ساتھ والے گاؤں کے ملیچھ نوجوان کی رنگ رلیوں کی کہانی انہیں سنا دی۔ کہانی کے آخر میں پنڈت

جی گرج کر بولے۔

"آپ کا دھرم آپ کے سامنے نشٹ ہو رہا ہے۔ وہ اچھوتوں کی چھوکری ہم سب کا دھرم بھرشٹ کر رہی ہے اور آپ کی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کہ نظر ہی نہیں آ رہا۔ ہمارے دھرم پر کھلا حملہ کیا جا رہا ہے اور آپ سب دم سادھے بیٹھے ہیں۔ ایک دن اس دھرتی پر سے ہمارے دھرم کا ناش ہو جائے گا اور یہاں پر پرماتما کا وہ قہر نازل ہو گا کہ مہابھارت کا یدھ بھول جاؤ گے۔"

ساری محفل پر کپکپی سی طاری ہو گئی تھی۔ ان کی گفتگو کے دوران تمام لوگ کانوں کو ہاتھ لگا لگا کر "ہرے رام، ہرے رام"، "ست رام، ست رام" کہے جا رہے تھے۔

"کلجگ گھور کلجگ" سالہ وساکھی رام بولے۔

"اندھیر ہے بھگوان کا۔" کونڈو مل بولا۔

"رام نام ست ہے۔" سالگ رام منمنایا۔

"مہاراج اس پاپ کا کچھ اپائے کیجئے۔" سنتوش بھاٹیہ نے اونگھتے ہوئے کہا۔

پھر وہ سب مل کر کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرنے لگے تا کہ اپنا دھرم نشٹ ہونے سے بچا لیں۔

عین اس لمحے جب پنڈت دوارکا داس اس دھرم بھرشٹی کا رونا رو رہا تھا اس کی نوجوان بیٹی شوبھا اپنے گھر کی مشرقی دیوار کی پرلی طرف پہنچ چکی تھی۔ دھان کے کھیتوں میں چھپے بھیکو نے اٹھ کر اس کی کلائی پکڑ لی اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا! آج اتنی دیر کہاں لگا دی تھی کب سے تمہارا منتظر ہوں یہاں۔"

"ہائے ہائے!" شوبھا نے تھوڑی سی لجا کر کہا۔ "میں کیا کرتی جانے اتنے مہمان کہاں سے آن مرے۔"

"بھاڑ میں گئے تمہارے مہمان۔" بھیکو نے اسے زمین پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"سینٹ میری کی سیڑھیوں کے باہر راشد بے چینی سے سسٹر مرسی فوک کا منتظر تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ مرسی فوک نے اسے کئی دفعہ اوما سے ملانے کے لئے کہا تھا۔ "بس اب اسے دو تین روز بعد آپ سے ملادوں گا۔ سسٹر۔ کل مجھے ڈگری مل جائے گی اور پرسوں میری شادی ہو جائے گی۔ اس سے اگلے روز ہم لوگ شہر چلے آئیں گے۔ سسٹر آپ بہت اچھی ہیں۔ بہت ہی اچھی آپ نے مجھے بہت سہارا دیا۔ میری تعلیم کے اخراجات بھی اتنے برداشت کئے۔ یہ سب کچھ آپ ہی کے کارن ہے۔ سب آپ ہی کا دیا ہے۔"

"ایسا مت کہو-- سب اس خداوند کی طرف سے ہوا۔ خداوند یسوع کو یہی منظور تھا۔"

انسانیت کی دیوی اپنی خاموش سیاہ آنکھیں لئے چپ چاپ کھڑی تھی۔ سفید براق لباس میں ملبوس پاکیزہ فرشتوں کی مانند، اس نے کتنی مدد کی تھی راشد کی یہاں، شہر میں اس کا اور تھا ہی کون، جب وہ بچہ تھا تو ایک دن یہ نن اس کے سکول میں ایک ڈبے میں بیٹھ کر دودھ بانٹنے آئی تھی۔ پھر وہ اس سے کتنی باتیں کرتی رہی اور اگلے روز ماسٹر جب شہر آئے تو ان سے نہ جانے کیا باتیں کر کے اسے کانونٹ سکول میں داخل کروز دیا جو چرچ ہی سے ملحق تھا۔ یہاں راشد بڑے بڑے امیروں کے بچوں کے ساتھ پڑھتا رہا۔ سکول سے کالج، سب جگہ سسٹر مرسی فوک اس کی کفالت کرتی رہی۔ اس نے کبھی ماسٹر جی کو بھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ آج وہ ایک ڈاکٹر بن چکا تھا۔ کل اسے ڈگری مل جائے گی۔ اس روز سسٹر کتنی خوش ہو گی۔ اس نے سوچا اور آنے والے وقت کے تصور ہی سے اس کا دل کھل اٹھا۔ اس نے اپنی زندگی کا کوئی پہلو اس عظیم عورت سے نہیں چھپایا تھا۔ حتیٰ کہ وہ خط بھی جو اوما اسے لکھا کرتی تھی۔

"آسمانی باپ تم دونوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔ مقدس فرشتے اپنے پروں کا

سایہ تم پر ڈالے رکھیں تاکہ دنیا بھر کے دکھوں سے پناہ پائے ہو۔" سسٹر مرسی فوک نے محبت سے اس کا ماتھا چوم کر کہا۔

"بوائے! مجھے کل مشن کے ساتھ جانا ہے۔ لیکن میرا دل ناگری میں تمہارے ہاں ہوگا۔ اور میری دعائیں نیک تمنائیں تم دونوں کے لئے! اوکے۔ وش یو گڈ لک۔"

اگلے روز ایک شاندار تقریب میں اسے ایم بی بی ایس کی ڈگری سے نوازا گیا۔ کالج پرنسپل نے خاص طور سے اس کی محنت سے بھرپور زندگی کی مثال پیش کی۔ ایک یتیم بچہ آج ایک مکمل ڈاکٹر تھا۔ برسوں پہلے یہ سپنا دیکھ کر اس کی ماں مر گئی تھی اور یہی سپنا آنکھوں میں لئے باپ نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ سپنا وہ حسین خواب شرمندہ تعبیر ہو چکا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر تھا۔ فسٹ کلاس آفیسر، زندگی کی ہر آسائش اس کی منتظر تھی-! ڈگری ہاتھ میں پکڑے جب وہ اپنے محسن ماسٹر نور محمد سے گلے ملا تو نہ جانے کیوں وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح رو دیئے -شاید پرانے زخم کھل گئے تھے۔ اپنے مرحوم دوست کی یاد تازہ ہو گئی تھی۔

ماسٹر صاحب تو اسی روز گاؤں چلے گئے انہیں کچھ خفیہ انتظامات کرنے تھے۔ یہ سارا کام خفیہ ہی کیا جا رہا تھا کیونہ براہمنوں سے کسی بھی کمینگی کی توقع کی جا سکتی تھی۔ ماسٹر نور محمد نے مسلمانوں کی بستی سے چند بوڑھے کو اپنا ہم خیال بنالیا تھا اور وہ لوگ ان کی ہر طرح مدد کرنے پر تل گئے تھے۔

اس رات جب محمد حسین کی بہن اور ماسٹر صاحب کی بیوی اوما کے حنائی ہاتھوں کو مہندی سے رنگ رہی تھی۔ عین اسی لمحے پنڈت اوم پرکاش کی حویلی میں اچھوت نوجوانوں کا ایک مجمع لگا ہوا تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو اوما سے بیاہ کے امیدوار تھے۔ ماسٹر صاحب کے ہمسائے کا لڑکا انہیں پل پل کی خبر پہنچا رہا تھا۔ رات اپنے دامن میں آنے والی صبح کی تباہ کاریوں سے بے نیاز جانے کتنے دلوں کی حسین تمنائیں سمیٹے آہستہ

آہستہ رینگتی جارہی تھی۔

اینڈرسن نے کہا تھا:

"ہر انسان کی زندگی پریوں کی ایک کہانی ہے جو خداوند نے لکھی ہے۔"

لیکن اینڈرسن ایک تخیل پرست رومانی انسان تھا جس نے اسنو واہٹ اور سنڈریلا کی ایک علیحدہ دنیا تخلیق کرلی تھی جو بچوں کو تو مطمئن کر سکتی ہے لیکن عام انسان کو نہیں۔ اسے شاید یہ علم نہیں تھا کہ اس بے نیاز خدا کی بنائی ہوئی خوبصورت دنیا میں بہت دکھ ہیں۔ بڑی تکلیفیں ہیں اور چھوٹے چھوٹے دکھی انسانوں کی زندگیاں پریوں کی کہانیاں کسی حالت میں نہیں ہو سکتیں۔

محبت کا یہ پٹھان۔ یہ خوبصورت آنکھوں اور سیاہ بالوں والا داشہ اینڈرسن کی دنیا کی ان وادیوں میں خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ جہاں پھول کھلتے ہیں۔ اور برکھا کی ٹھنڈی پھوار برسا کرتی ہے۔

دسمبر کی اس برفانی رات جبکہ باہر خنک ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں وہ اپنے ہوسٹل کے محفوظ کمرے میں مطمئن ہو کر اچھی اچھی چیزوں، خوبصورت زندگی کے سپنے دیکھ رہا تھا۔ محبت کی ان راتوں کے خواب جو اس نے اور اوما نے بھارت ندی کے کنارے ایک دوسرے کی آغوش میں دیکھے تھے۔ ان پرانے گیتوں کے سپنے جو اس نے یوکلپٹس کے پھول کے کنج میں بیٹھ کر گائے تھے۔

سڑکوں کے اس پار سینٹ میری کے عبادت خانے میں آدھی رات کے ماس کے گھنٹے بجنے لگے۔ کہیں دور رات کے سناٹے میں کیرل گانے والی ٹولیوں نے اپنے نغمے شروع کیے تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

خاموش رات۔

مقدس رات۔

مقدس ماں اور اس کا بچہ۔

"اور سنو سنو پیغامبر فرشتے گاتے ہیں۔"

رات ڈھلتے ڈھلتے ڈھل گئی۔

اشیر سنگھ جب جی صاحب زیر لب گنگناتا کھیتوں کی طرف جارہا تھا۔ اس کی عادت تھی ہر وقت کچھ نہ کچھ گنگناتے رہنے کی اور اکثر وہ گورو گرنتھ صاحب کے اشلوک یہ گنگناتا تھا، یا ہیر وارث شاہ اور کوئی پنجابی فوک کہانی اس کے علاوہ اسے کچھ بھی پسند نہیں تھا۔

"اشیر بھیا!"

"او راشد" ۔۔! اشیر سنگھ نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ کر گلے لگالیا۔ پھر وہ دونوں دوست کنویں پر ہی بچھی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

"آج ہماری شادی ہو جائے گی۔" راشد نے خوشی سے بے قابو ہو کر اسے کہا۔

"واہگورو سچا پادشاہ تم دونوں کو سکھی رکھے۔" پھر وہ دونوں دوست آپس میں مشورہ کرنے کرنے لگے اور اشیر سنگھ نے اسے آنے والے تمام خدشات سے بے فکر ہو جانے کو کہا۔

"جب تک خالصہ زندہ ہے ۔۔ تب تک تو کسی کی جرأت نہیں اس کے بعد جو کرے کرتار" ۔۔ اس نے راشد کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔ دونوں دوست کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ گھر چلا آیا جہاں ماسٹر جی اور کیشو رام اس کے شدت سے منتظر تھے۔

غلام نبی، محمد یار، حسین نائی اور فتح محمد کمہار کے علاوہ دو تین اور آدمی بھی ماسٹر جی کی بیٹھک میں کیشو رام کے ہمراہ بیٹھے تھے۔ وہ سب لوگ سر جوڑے کسی معاملے پر غور و خوض کر رہے تھے۔ ابھی ابھی رنگا مستی نے خبر دی تھی کہ پرکاش واپس نہیں گیا بلکہ

اس نے مزید چھٹی منظور کروالی ہے اور بستی کے سارے اچھوتوں کو اپنے گھر میں اکٹھے کرر کھا ہے۔ شام مغرب کا وقت نکاح کے لئے مقرر ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ راشد صبح صبح اوما اور کیشو رام کے ہمراہ شہر چلا جائے گا۔

"بھائیو! تم سب کو یہاں اکٹھے کرنے کا مقصد تو تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا - اب یہ تم پر نربھر ہے کہ ان ملیچھوں کے ہاتھوں اپنے گاؤں کی عزت بھرشٹ کروانا پسند کرتے ہو یا نہیں۔ میری تو بھگوان سوگند یہی اچھا تھی کہ اوما کا ویواہ تم میں سے کسی کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ وہ تمہاری جاتی کی ہے - لیکن کتنے شرم کی بات ہے کہ ایک ملیچھ سے اس کا ویواہ ہو رہا ہے اور اس کا پاپی باپ اپنے ہاتھوں ہماری مان مریادہ بھرشٹ کرنے پر تلا ہوا ہے۔" پرکاش بڑی مکاری سے زہر اگل رہا تھا۔

"بھائیو! ہم لاکھ برے سہی لیکن آخر آپ کے دھارمک بھائی بند تو ہیں۔ میں نے منشی جی سے کہہ دیا ہے اگر کسی کو شکایت ہو تو مجھ سے کہے میں آپ کا مالک نہیں داس ہوں اور اس ناطے آپ کی سیوا کرنا میرا دھرم ہے۔ آگے جو کچھ ہوتا رہا اس پر ہمیں شما کرنا بھائیو! لیکن بھگوان کے لئے آج کچھ کر دیوں دھرم نشٹ ہو جائے تو ہمارے جینے پر لعنت......"

پرکاش مجمع کو خوب بھڑکا رہا تھا۔ آج وہ مالک سے نوکر بننے کو بھی تیار تھا - آج وہ اچھوتوں سے کئے گئے تمام مظالم کی معافی مانگ رہا تھا۔ محض اس لئے کہ اوما کی عزت سے کھیل سکے۔

"یہ ویواہ نہیں ہوگا" --!

"ہم گاؤں کی عزت نہیں لٹنے دیں گے۔"

"ہم ان ملیچھوں کو بھرشٹ کر دیں گے۔"

"مہاراج پنڈت جی کی جے۔"

لوگوں کا جوش بڑھتا جا رہا تھا وہ اپنے دھرم کو نشٹ کرنے والوں کو نشٹ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

"شانتی! شانتی بھائیو شانتی -"

پرکاش آگ بھڑکا کر اس پر دکھاوے کی پھونکیں مارنے لگا -!!

تمام اچھوت اور برہمن اپنے ہاتھوں میں ڈانگیں اور نیزے تھامے کھڑے تھے۔ ایک دو کے پاس رائفلیں بھی تھیں جو انہیں شکار کرنے کے لئے پنڈتوں کی طرف سے ملی ہوئی تھیں۔

جیسے جیسے پرکاش بولتا جا رہا تھا ان کے غیظ و غضب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن ابھی وہ انہیں قابو رکھنا چاہتا تھا وہ تو اپنے منصوبے کو جو اس نے شہر سے حاصل کئے گئے غنڈوں کی مدد سے تیار کر رکھا تھا۔ اس وقت عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ جب عین نکاح کا وقت ہوا۔ اسے زکرم کے ذریعے پل پل کی خبر مل رہی تھی۔

منشی مہنگا مل نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جنہوں نے ایک طرف بچھی ہوئی چادروں پر کڑاہ سے بھری ہوئی کراء کی پلیٹیں چننا شروع کر دیں اور وہ خود سب لوگوں کو ضیافت کھانے کی دعوت دینے لگا۔ اچھوتوں کے دل میں آج پہلی دفعہ اپنے مالک کے لئے محبت اور ماسٹر صاحب کے لئے نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔

بے چارے سیدھے سادے انسان، انہیں ایسی چالبازیوں کا بھلا کیا علم ہو سکتا تھا۔ ان کے لئے تو باعث حیرت یہ بات تھی کہ آج وہ اپنے مالک کے گھر میں اس کی طرف سے دی گئی دعوت کھا رہے ہیں۔ ان کا مالک ان پر اتنا مہربان ہوگا اس بات کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو بیچارے سیدھے سادھے انسان تھے جنہیں کوئی بھی کسی بھی وقت مذہب کے نام پر ورغلا سکتا تھا۔ جو دو چار گھاگ قسم کے تھے۔ وہ پہلے ہی سے پرکاش کی مٹھی میں آچکے تھے۔ منشی مہنگا مل نے ساری زندگی مالکوں کی نوازشات کا

آج اس نازک موقع پر حق ادا کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ لوگ آپس میں منصوبہ بنانے لگے اور شام ڈھلنے کے منتظر ہو گئے۔

مسلمانوں کی بستی سے حی علی الفلاح کی آواز آ رہی تھی۔

اور پرکاش بپھرے ہوئے اچھوتوں اور براہمنوں کا گروہ لے کر ہاتھ میں اپنی سرکاری پستول پکڑے ادھر آنے کو بالکل تیار کھڑا تھا۔

محمد حسین کی بہنوں نے اوما کو دلہن کی طرح سجا کر ایک کمرے میں بٹھا رکھا تھا۔ لال سرخ جوڑا اس کے لئے ماسٹر صاحب کی بیوی نے خود تیار کیا تھا۔ سرخ جوڑے میں سمٹی سمٹائی وہ آسمان سے اتری ہوئی حور معلوم ہو رہی تھی۔ بادامی آنکھوں کو کاجل نے دو آتشہ بنا ڈالا تھا۔ ہونٹوں کی لالی جیسے چناروں کو آگ لگ گئی ہو۔ حسن اور تقدس کا حسین سنگم جیسے خدائے ذوالجلال نے مونالیزا کی تصویر میں جان ڈال دی ہو۔

ماسٹر صاحب کی بیوی نہ جانے کتنی بار اسے چوم چکی تھی اور محمد حسین کی بہنیں تو باری باری اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ سے پکڑ کر سر اونچا کر کے اس کی آنکھوں کے مدھ بھرے پیالوں میں خود کو ڈبو چکی تھیں۔

اجنتا کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس کی تہذیب، اس کا تمدن، اس کا آرٹ سبھی کچھ زادہ تھا اس کے رخساروں کی چمک اس کے ہونٹوں کی رخشندگی اس امر کی غماز تھی کہ اس نے ظالم سماج کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا ہے۔

محلے کی مسلمان لڑکیاں اس کے گرد ہالہ بنا کر بیٹھی تھیں۔ سجی سجائی لڑکیاں جیسے چاند کے گرد ستاروں نے دائرہ بنا رکھا ہو--!

اسی کمرے سے ملحق دوسرے کمرے میں راشد خان ایم بی بی ایس کے گرد آٹھ دس مسلمان بیٹھے تھے۔ بس مولوی صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔ سفید براق جیسے کپڑے پہنے کمرے کے ایک گوشے سے لگا کیشو رام کبھی ایک نظر اپنی زندگی بھر کی کمائی پر ڈالتا

اور کبھی ایک نظر اپنی خوش بختی کے نشان راشد پر، زندگی یوں بھی ہو جائے گی اسے اپنی خوش بختی پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا--

کوئی طاقت نہ جانے کیوں اسے بار بار یہ احساس دلا رہی تھی کہ یہ خوشیاں مسرتیں یہ سب کچھ بس ایک لمحے کے لئے ہے۔ ابھی یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا--!

نہیں نہیں! آخر تو بھگوان کو اس پر ترس آنا تھا۔ اس کے دن بھی پھرنے ہی تھے۔ اس کے جیون میں بھی سکھ اور آنند کے یہ لمحے آنے ہی تھے۔

نہیں نہیں- تو ایک معمولی اچھوت تیرا خوشیوں پر کیا حق ہے۔ یہ مسرتیں تیرے لئے نہیں بنائی گئیں۔ پھر یہ سب کچھ؟ اسے اپنی آنکھوں پر یقین کیوں نہیں آ رہا--کیوں نہیں آ رہا--!!

اچھوتوں کا پنڈت آ گیا۔ مولوی صاحب بھی آ گئے۔

"کہوا عوذ باللہ۔"

اور راشد نے ان کے پیچھے پیچھے ابھی شیطان سے پناہ مانگنے ہی کو تھا کہ وہ دروازے پر آن دھمکا۔

ٹھک ٹھک ٹھک -دروازہ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔

"دروازہ کھولو ورنہ ہم توڑ دیں گے۔"--

سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ پنجاب کا میلا جٹ اشیر سنگھ اپنی ڈانگ سنبھالے دروازے کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سامنے اردگرد کی بستیوں کے سینکڑوں مسلح ہندو کھڑے تھے۔ سب سے آگے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول لے کر جگن ناتھ کھڑا تھا جو ناگری کا مانا ہوا غنڈہ تھا اور جسے جیل سے صرف اسی مقصد کے لئے فرار کروایا گیا تھا۔ ایک طرف پنڈت پرکاش اور مہنگا مل بھی کھڑے تھے۔ پنڈت پرکاش کے ہاتھوں میں اس کا سرکاری ریوالور تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" اشیر سنگھ للکارا۔

"تم ایک طرف ہٹ جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"ہم دھرم بھرشٹ نہیں ہونے دیں گے۔"

"کلجگ گھور کلجگ"--

"مار ڈالو۔"

"ان کا گھر پھونک دو"!

"ہماری کنیا ہمارے حوالے کردو وگرنہ ایک ایک کو چن چن کر ماردیں گے۔"

طرح طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

"ٹھہرو۔" اچانک ایک آواز ابھری اور کیشو رام ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی پگڑی ان کے پاؤں میں رکھ دی۔ "مجھ پر دیا کرو، مہاراج دیا کرو۔"

لیکن جگن ناتھ کی ایک ہی ٹھوکر نے اس کی پگڑی کو دور پھینک دیا۔

"ظالمو! تم مارنا ہی چاہتے ہو تو بھگوان کے لئے مجھے مار ڈالو۔ یہ سب کچھ میں نے ہی کیا ہے۔ میری جان لے لو لیکن"......

"بڈھے اپنی لڑکی ہمارے حوالے کرتا ہے یا......" اس کی بات کاٹ دی گئی۔

اشیر سنگھ طیش میں آ گیا۔

"سری واہے گورو جی کا خالصہ۔ سری واہے گورو جی کی فتح۔" اس نے للکار اور لاٹھی جگن ناتھ کے سر پر مارنے کی کوشش کی۔ لیکن دائیں بائیں دو برچھیوں نے اسے چھید ڈالا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور خالصہ امر ہو گیا۔

"بے وائی متر ارب راکھا"-- اس نے گرتے گرتے راشد کی طرف دیکھا جو اپنی خوبصورت اور پھٹی پھٹی نظروں سے پتھر بنا یہ سب کچھ دیکھے جا رہا تھا۔

محمد حسین دیوانوں کی طرح لپک کر سامنے آیا-- وہ بھی مارا گیا۔

سفید ڈاڑھی اور سرخ چہرے والے بوڑھے انسان نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ہم سب کو مار ڈالو مگر خدا کے لئے اسے کچھ نہ کہنا"-- راشد کو انہوں نے اپنی اوٹ میں کر لیا تھا۔ لیکن وہاں کسی کی کون سنتا تھا۔ ان کے چہرے اور ڈاڑھی کا رنگ ایک ہی جیسا ہو گیا۔ گولی ان کے ماتھے پر لگی تھی۔ کیشو رام راشد سے لپٹ گیا اسے الگ کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔

اوما یہ ہنگامہ سن کر دروازے میں چلی آئی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی سب عورتیں اس کے قریب سے چیختی چلاتی بھاگ گئی تھیں۔

راشد پر پاؤں کی ایڑوں سے لے کر کنپٹیوں تک ایک اذیت ناک کرب کا دور شروع ہو چکا تھا۔ وہ پتھر بنا کھڑا تھا۔ اسے یوں لگتا جیسے کوئی اس کے زخموں میں آتشیں سلاخیں چبھو رہا ہو بے رحمی سے زور زور سے زخموں کے دور اندر تک روح کے آخری گوشے تک اور وہ اس کرب انگیز درد کی تاب نہ لا کر کراہنے لگتا- اس کا جی چاہتا کہ اوما آ جائے کہیں سے آ جائے۔ بند دروازوں کو توڑ کر پتھر کی دیواروں کو پھاڑ کر۔ دونوں کے درمیان حائل پردے چیر کر۔

پھر یکایک اوما دلہن بنی موتیوں کا گجرا پہنے چمبیلی اور گلاب کے پھولوں کو اپنے بالوں میں گوندھے لال عروسی دوپٹہ اوڑھے۔ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اندر آ گئی۔ راشد لال دوپٹے کے اندر سے اس کی شریر اور مسرت سے لبریز آنکھیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لبوں پر وہی ملکوتی حسن جگمگا رہا تھا۔ وہی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

پھر اچانک لال عروسی دوپٹہ اس کے چہرے پر جا گرا۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی تھی۔ اتنا قریب جہاں سے وہ اس کے چمبیلی اور گلاب کے پھول بھی سونگھ سکتا تھا-- ان کی خوشبو محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن یہ لال دوپٹہ اس کے چہرے پر کیسے آن پڑا۔ اس

نے سوچا یہ لالی کیسی ہے؟ چاروں طرف خون ہی خون۔ سرخی ہی سرخی-! اس کی نبضیں ڈوبنے لگیں۔

دلہن نہ آئی وہ ساتھ والے کمرے میں تھی۔ دونوں کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی۔ موت کی راہ پر جانے والے محبت کے مسافر نے زندگی کے آخری لمحوں تک اس کا انتظار کیا۔ لیکن وہ پھر بھی نہ آئی۔ وہ اس کے اتنی قریب تھی لیکن اس کی آواز تک نہ سن سکی۔

اوما کے چاروں اطراف کائنات یک لخت بہت تیزی سے دوڑنے لگی۔ فضا کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ شعلے اوپر ہی اوپر اونچے ہی اونچے اٹھتے گئے زمین تا آسمان ساری دنیا- ساری کائنات نے سرخی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اس نے خوفزدہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے -مرے ہوئے انسانوں کو دیکھا اور دھڑام سے گر گئی۔

اس کے سرخ پپوٹوں میں انتہائی تیز جلن کہیں سے گھس آئی تھی۔ کرہ آفتاب اپنی تمام تر تیز رفتاریوں کے ساتھ زمین سے ٹکرا گیا تھا۔

یہ کیا ہو گیا؟ جیسے وہ سب لاشیں اسے کہہ رہی تھیں خدا کی قسم یہ سب غلط ہے۔ سراب ہے، دھوکہ ہے تمہاری نظر کا بہت برا خواب ہے۔ ابھی ہم جاگیں گے تب اس جھوٹ کی قلعی کھل جائے گی۔

لیکن یہ سب تو حقیقت تھی-!!

راشد مر چکا تھا۔ اس کی موت سے خدا کی تخلیق کی ہوئی ایک خوبصورت زندگی کے ختم ہو جانے سے کسی چیز پر کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ کائنات کا نظام اسی طرح چل رہا تھا۔ ساری دنیا اسی طرح زندہ تھی۔ رونے والا بھی تو کوئی نہیں رہ گیا۔ ایک مکمل اٹھائیس سالہ جوان خوبصورت اور گرم زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ وہ جوان کا دھرم "بھرشٹ" کرنے چلا تھا۔ اسے براہمنوں نے مار ڈالا۔ راشد اندھیروں کے پار چلا گیا۔ جس کے

حسن میں زندگی کی، جوانی کی، انسانیت کی، پاکیزگی تھی۔ جس کا کندن ایسا رنگ تھا۔ جس کی مقدس مرسی فوک جیسی حیرت زدہ جھپکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ جس کے بالوں میں رات کے سمندر جیسے طرح طرح کے رنگ جھلکتے اور لہریں مارتے تھے جو زندگی کی ابدی غنایت، ابدی محبت کا فرشتہ تھا جس طرح کے کرسمس کے خوبصورت کارڈوں پر بنے ہوتے ہیں۔

لیکن اس کا کندن ایسا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ اس کے تراشیدہ ہونٹ خون آلود تھے۔ اس کی بڑی بڑی حیرت زندہ آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اس کے سمندر کی لہروں جیسے بال خون سے چپک گئے تھے۔ جوانی کی شدید پاکیزگی خون آلود ہو گئی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے کمرے کے پتھریلے فرش پر کیشورام اور ماسٹر نور محمد کے درمیان لیٹا تھا۔ سرخ اور جیتے جاگتے جوان خون کی جھیل سی اس کے چاروں طرف بن گئی تھی۔

پرکاش کی چلائی ہوئی پہلی گولی اس کے خوبصورت بالوں کو چیرتی اس کے حسین دماغ میں گھستی چلی گئی تھی۔ پھر چار مزید گولیوں نے اس کا جسم چھلنی چھلنی کر دیا تھا۔

سامنے دروازہ کھلا تھا اور محبت کا مسافر موت کے جنگل میں اکیلا چلا جا رہا تھا۔ باہر کائنات خاموش تھی اور شب تیرہ و تار- تاریک فضاؤں میں عناصر کے طوفان کی گھن گرج شدید ہو گئی تھی۔ جھکڑ جو بہت دیر سے آہستہ آہستہ چل رہا تھا رات کی ساعتوں کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یک لخت زور پکڑ گیا۔

اوما کی آنکھ جہاں کھلی وہ ایک سجا سجایا کمرہ تھا۔ اس طرح کا کمرہ اس نے زندگی میں ایک بار پہلے دیکھا تھا وہ بھی ایسا نہیں بلکہ اس سے ملتا جلتا کمرہ تھا ایک بار جب وہ شہر گئی تھی۔

کرب اور حیرانگی کی ملی جلی کیفیت میں اس نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ وہ ایک خوبصورت فوم کے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی، کھڑکیوں پر گہرے نیلے پردے پڑے تھے اور کمرے میں سجاوٹ کا وہ سامان جس کا وہ تصور بھی نہ کر سکے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ

رہا تھا۔ بس کوئی مسلسل اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسائے جا رہا تھا۔ غنودگی! گہری غنودگی اور پھر نیند۔ وہ پھر سو گئی۔

ایک نرس اس کے سرہانے کھڑی تھی جو پتھر کے اس بت کو مختلف انجکشن لگائے جا رہی تھی۔ پھر اسے مکمل ہوش آ گیا۔

اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آنے لگا۔ اذیت کا ایک لمحہ کتنا جاں گسل تھا۔ کتنا بھاری تھا۔ دھندلے دھندلے نقوش اب واضح ہوتے جا رہے تھے۔ سب مر گئے۔ سب کچھ ہی تو ختم ہو چکا تھا۔ اس نے سوچا پھر، آخر وہ کیوں زندہ ہے؟--وہ کیوں نہیں مر گئی۔ وہ سوچتی رہی۔

اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آتا جا رہا تھا۔ گزری ہوئی قیامت کا ایک ایک لمحہ اسے ڈس رہا تھا۔ سب کچھ اس کی آنکھوں ہی کے سامنے تو ہو گیا تھا۔ پھر وہ گر پڑی تھی۔ لیکن یہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ گرتے وقت کسی نے اسے تھام لیا تھا اور ایک جیپ میں غالباً اسے ڈالا گیا تھا۔ اس نے اپنے اغوا کرنے والوں کو اچھی طرح جان لیا تھا- یہ جگن ناتھ اور پرکاش تھے۔ جیپ میں وہ بے ہوش ہو گئی تھی اور ہوش آنے پر اس بات کا احساس کمرے میں لگی کھڑکی نے دلایا تھا ورنہ اسے دن اور رات کا ہوش کہاں۔ اسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا وہ خود کون ہے؟ کیا ہے؟--وہ چپ چاپ اس کھانے کو زہر مار کر لیتی جو ایک نرس اس کے لئے تین دنوں تک مسلسل لے کر آ رہی تھی۔ اس نے نرس سے کئی بار پوچھا وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟--!

لیکن نرس شاید گونگی تھی اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ پھر وہ انہی سوچوں میں مستغرق ہو جاتی۔ خیالات کے طوفان بڑھتے چلے آتے اور اس کی روح کے ساحل کی ریت پر پھیل جاتے۔ پھر بے خیالی کے لمبے وقفے۔ تب لہریں اس ریت سے پیچھے ہٹتے ہٹتے غائب ہو جاتیں اور وہ اپنے سامنے اس ساحل کی ریت کو چمکتا دیکھتی رہتی۔ بے خیال ہر

قسم کے احساس سے مبرا اور کچھ نہ سمجھ پاتی۔ یہ ریت کیوں چمک پاتی ہے۔ لہروں کے نقش قدم اس پر کیوں موجود نہیں رہتے اور وہ طوفان جس کا اب کوئی کنارہ بھی نظر نہیں آتا ساکن کیوں ہے؟ منجمد کیوں ہو گیا ہے؟ لیکن اس احساس کے آتے ہی طوفان پگھلنے لگتا۔ اس کی لہریں آگے بڑھنے لگتیں اور چمکتی ریت پر چھا جاتیں۔

پھر وہ طوفان سے بے تعلق ہو جاتی اسے یوں لگتا جیسے وہ خود ایک تماشائی ہو اور یہ سب کچھ اس کے سامنے بطور تماشا پیش کیا جا رہا ہو۔ وہ حیران تھی اتنا سب کچھ گزر جانے کے باوجود وہ روئی کیوں نہیں؟ وہ نازک خیال لڑکی جو معمولی باتوں پر رو پڑتی تھی آج نہ جانے اس کے آنسو کہاں کھو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا سب لٹ گیا۔ سب کچھ چھن گیا اور وہ خاموش تماشائی بنی سب کچھ دیکھتی رہی۔

لیکن تیسرے روز وہ اچانک پھٹ پڑی۔ وہ رونے لگی۔ آنسوؤں کی لہریں جنہیں اس نے چٹانوں کے نیچے مقید کر رکھا تھا تمام دیواریں توڑ کر بہہ نکلیں۔ منجمد سیال آنسو جو اس کے سینے پر برف کا تودہ بن کر جم گئے تھے جیسے سورج نے انہیں پگھلا دیا ہو-

وہ روتی رہی تڑپتی رہی۔ اس نے شدت سے مرنے کی خواہش کی لیکن اسے موت نہ آئی۔ اگلے روز صبح دروازہ کھلا تو پرکاش اپنی تمام تر شیطان کاریوں سمیت اس کے سامنے موجود تھا۔ اوما کا جی چاہا کہ اس ذلیل براہمن کا گلہ گھونٹ ڈالے۔ لیکن یہ تو صرف سوچنے کی بات تھی۔ وہ پتھر کا بت بنی اس شیطان کو دیکھتی رہی جس نے اس کے ارکانوں کا گلہ اتنی آسانی سے گھونٹ ڈالا تھا جتنی آسانی سے کوئی مکھن سے بال نکال کر باہر پھینک دے۔

"ذلیل، کمینے، کتے۔" اس نے نہ جانے ایک ہی سانس میں کتنی گالیاں پرکاش کو دے ڈالیں لیکن وہ ہنستا رہا۔

"اب بتاؤ میری جان! آج بھی مجھ سے بچ جاؤ گی اب تو میں نے ان دیواروں ہی کو

گرادیا ہے جو مجھے تمہارے اور اپنے درمیان حائل نظر آتی تھیں۔" وہ مسکراتا ہوا اوما کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شیطانیت نے اس کے چہرے کو بھیانک بنا ڈالا تھا۔ اوما کے سوگوار حسن نے اس کی آنکھوں میں شہوت کے لال لال ڈورے دوڑا دیئے تھے۔

اوما نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

"اور مارو--- میری جان! تمہارے جسم کے تو ایک لمحہ کی بھی یہ قیمت نہیں ہے اور پھر مجھے تو مزا ہی ایسے شکار کا آتا ہے۔" یہ بدستور مسکرائے جا رہا تھا۔

لاچار اور بے بس عورت آخر تھک ہار کر گر پڑی۔ "مجھے جان سے مار ڈالو۔ خدا کے لئے مار ڈالو"--!

"ہوں! ان ملیچھوں نے تجھے یہ خدا کا سبق پڑھا دیا ہے۔ کیا سمجھتی تھی دھرم بدل لینے سے، تو ہم سے بچ جائے گی۔" وہ غصہ سے پھنکارتے ہوئے بولا۔

"خدا کے لئے پنڈت جی! مجھے مار ڈالئے۔ میرے ساتھ یہ ظلم نہ کیجئے۔" وہ اس کے پاؤں سے لپٹ گئی۔

اس نے ذلیل براہمن کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ وہ روتی رہی۔ چیختی چلاتی رہی۔ اس نے ہزار ہا بار خدا کو اپنی مدد کے لئے بلایا۔ گلہ پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو آوازیں دیں لیکن ساؤنڈ پروف کمرے نے اس کی آہ و بکا کو باہر نہ جانے دیا۔ اس کا دامن عصمت تار تار ہو گیا۔ کوئی اس کی مدد کو نہ آیا نہ زمین ہی پھٹی کہ وہ اس میں سما جاتی اور نہ آسمان گرا۔ صبح سے دوپہر۔ رات اور پھر صبح۔ وہ لٹتی رہی۔

حکومت کا ایک اعلیٰ آفیسر اس کی عزت سے کھیلتا رہا وہ جو اسے اپنی جاگیر ہی کا ایک حصہ سمجھتا تھا۔ اس کی عصمت دری کرتا رہا۔ اسے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ کسی نے اسے سنگسار نہ کیا۔ کسی کی اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ ناگری والے واقعہ کے سلسلے میں اس کا نام لے لیتا۔ پولیس آئی اعلیٰ حکام بھی موقعہ پر پہنچے اور پنڈت دوار کا داس کے بتائے

ہوئے ملزموں کو گرفتار کر کے لے گئے۔

کسی نے ان سے کچھ پوچھنے کی زحمت ہی گوارہ نہ کی اس لئے کہ وہ براہمن تھے۔ اونچی جاتی کے تھے بہت بڑے جاگیر دار ہونے کے علاوہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ اور حکومت کے نزدیک معززین کی فہرست میں بھی شامل تھے۔ لہٰذا انہیں یہ اختیار بھی حاصل تھا کہ جو چاہیں کرتے پھریں۔

اوما نے کئی دفعہ مرنے کی کوشش کی لیکن وہاں اس سے یہ حق بھی چھین لیا گیا۔ پھر اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی یہ آگ تو نہ جانے کب سے بھڑک رہی تھی۔ آخر وہ انتقام لے تو کس طرح؟ اس نے اب مرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ اب وہ زندہ رہنا چاہتی تھی صرف اس وقت تک جب تک کہ اس کے وہ دشمن جنہوں نے اس کی دنیا پھونک ڈالی تھی۔ اس کی ننھی منی خوشیوں بھری دنیا میں آگ لگا کر اسے خس و خاشاک کا ڈھیر بنا ڈالا تھا۔ مر نہیں جاتے تھے اس نے راشد سے اکٹھے جینے مرنے کا وعدہ کیا تھا اور اسے نبھانا بھی تھا۔ وہ راشد کی روح کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جانے کتنی دفعہ اکٹھے جینے مرنے کے پیمان باندھے تھے لیکن اب اسے ایک اور فرض بھی پورا کرنا تھا۔ اسے انتقام لینا تھا۔ وہ شعلہ جوالہ بنتی جا رہی تھی۔ اس کی نس نس میں آگ سی بھر گئی تھی اور ہر لمحے وہ کسی موقع کی منتظر تھی--!

پھر ایک روز اوما بھاگ گئی۔

وہ موقع پا کر فرار ہو گئی۔ حکومت کے کئی اعلیٰ افسر اس کے شناسا بن چکے تھے کیونکہ اسے باری باری ہر ایک کے بستر کی زینت بننا پڑا تھا۔ اس نے زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور زندہ رہنے کے سارے ڈھنگ سیکھ لئے تھے۔ وہ اب اچھوت لڑکی نہیں تھی۔ اب تو وہ ناگن بن چکی تھی-- سراپا انتقام ناگن جو ہر ایک کو ڈس لینا چاہتی تھی۔

پرکاش کے ایک دوست سے ساز باز کر کے وہ اس کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اور پھر

ایک روز اسے بھی زہر دے کر مار ڈالا اور بمبئی چلی آئی۔ جہاں ایک نئی زندگی اس کی منتظر تھی۔

کانپور سے بمبئی تک پہنچنے کی کہانی بڑی مختصر تھی۔ اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی تھی اسے ہر لمحے یہ خطرہ رہتا تھا کہ کسی بھی وقت پرکاش کے آدمی اسے مار ڈالیں گے اسے گوارہ نہ تھا کہ اپنا مشن ادھورا چھوڑ کر مر جائے۔ وہ بہت تیزی سے مختلف مراحل سے گزرتی ہوئی بمبئی کے اس بازار میں پہنچ گئی تھی۔

وقت نے اس نرم ونازک اور محبت کی ماری لڑکی کو ایک جہاں دیدہ اور مکار عورت بنا ڈالا تھا۔ اب اسے ہر لمحے اس موقع کا انتظار رہتا جب وہ اس بربریت کا حساب چکا سکے۔ سال بھر کے اندر وہ اوما سے "تتلی بائی" بن گئی۔

اس کے حسن کے چرچے بمبئی کی گلیوں اور بازاروں میں ہونے لگے تھے۔ ظالم کس غضب کا گاتی تھی۔ نہ جانے اتنا درد اس کی آواز میں کہاں سے آن بسا تھا۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد ہزاروں سے تجاوز کر گئی تھی۔ بمبئی لاکھوں کا شہر ہے۔ اس کا ہر کونہ "تتلی بائی" کے نام سے گونج رہا تھا۔ عام لوگوں سے لے کر اعلیٰ افسران تک اس کے گاہک تھے ملک کی مقتدر ہستیاں اس سے شادی کی خواہش مند تھیں۔ لوگ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے دیوانے ہوئے جا رہے تھے، لیکن اسے ابھی تک کسی کا انتظار تھا۔ وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ زندگی کی تمام رنگینیاں اس کے لئے بے معنی بن کر رہ گئی تھیں۔ وہ تو ہر لمحہ اس ہستی کی منتظر تھی جو اس کے انتقام کی آگ بجھانے میں اس کی مدد کر سکے۔

پھر ایک روز وہ گھڑی آ ہی گئی جس کے انتظار میں اس نے تین سال بیتائے تھے۔

آسام کی ستیل گھاٹی تقسیم ہندوپاک سے قبل ہی ڈاکوؤں کا مسکن بن چکی تھیں۔ میلوں لمبی یہ پہاڑی جس کے دامن میں جنگلات کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا ہے اپنے دامن

میں نہ جانے کب سے تمام انڈیا کے مشہور اور بدنام زمانہ افراد کو پناہ دیئے ہوئے تھی۔ آج تک حکومت وہاں سے کسی کو گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ درجنوں بار ہوائی جہازوں سے بمباری کروائی گئی۔ باقاعدہ فوج کے دستے روانہ کئے گئے لیکن چند کھنڈروں اور جھلسے ہوئے درختوں کے علاوہ حکومت کو وہاں سے کبھی بھی کوئی شے حاصل نہ ہو سکی۔

مشہور زمانہ ڈاکو مان سنگھ کا ساتھی جمعدار سنگھ ایک مرتبہ بمبئی آیا تو تتلی بائی کی ایک جھلک نے ہی اسے دیوانہ کر دیا اور آج وہ خاص طور سے اس کا گانا سننے کے لئے یہاں آیا تھا۔ تتلی بائی سراپا قیامت بنی اس کے سامنے بیٹھی تھی جس کی چھٹی حس بار بار اسے کہہ رہی تھی کہ یہی ہے جس کا تجھے تین سال سے اس شدت سے انتظار ہے۔ گانا شروع ہو گیا۔ تتلی بائی کی رسیلی آواز اور لہراتا بل کھاتا جسم جمعدار سنگھ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کی مجرمانہ زندگی سے نہ جانے کتنی ایسی عورتیں روزانہ آئی اور چلی گئی تھیں لیکن ایک بھی تو اس پتھر دل کو موم نہ کر سکی۔ آج تو جیسے یہ پتھر موم کی طرح پگھل کر رہ گیا تھا۔ تتلی بائی اسے یہاں سے بہت دور اس کے گاؤں میں لے گئی تھی۔ اس نے جمعدار سنگھ کو اس کا ماضی یاد دلا کر اسے رلا دیا تھا۔

"بس کرو"--وہ جھنجھلا کر کھڑا ہو گیا۔ چار سٹین گنوں نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس کے ساتھی حیران تھے آج سردار کو کیا ہو گیا۔ نوٹوں کا بنڈل اس نے تتلی بائی کے پاؤں میں پھینکا اور واپس جانے لگا۔

"ٹھہریئے" کی آواز نے جمعدار سنگھ کے قدم پکڑ لئے اس کے ساتھ ہی سٹین گنوں کا رخ بھی تبدیل ہو گیا۔

"تم ان کے بغیر کوئی بات نہیں کر سکتے کیا؟" تتلی باء نے بڑے نخرے سے سٹین گنوں کو ایک نظر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جمعدار سنگھ نے ایک نظر اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور چند سیکنڈ بعد وہ دونوں اکیلے

وہاں کھڑے تھے۔ تپلی بائی نے اس کے نوٹوں کا بنڈل اسے لوٹا دیا۔

"کم ہیں کیا؟" جمعدار سنگھ نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔

"نہیں"--

"تو پھر؟--"

"لٹیرے لوٹ کا مال نہیں کھاتے"--!

"کیسے جان لیا کہ مال لوٹ ہی کا ہے۔"

"ہم پیشہ ہوں۔ اتنی جان پہچان بھی نہ کروں گی۔"

"تمہیں تو ایسی باتیں نہیں سوچنا چاہیے۔ یہاں حلال کی کمائی تو آنے سے رہی۔"

"اس بحث کو چھوڑیئے۔" تپلی بائی نے گفتگو کا رخ بدلا۔

جمعدار سنگھ کے چہرے نے کئی رنگ بدلے تھے اسے اپنی کمزوری پر غصہ آنے لگا تھا۔

"پھر مجھے جانے دو۔" اس نے مڑ جانا چاہا۔

"نہیں"-- تپلی بائی اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بازو پھیلا رکھے تھے۔ جمعدار سنگھ پگھل کر رہ گیا۔

"کیا چاہتی ہو؟" اس نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"سمجھوتہ کرلیں۔"

"مجھے گرفتار کراؤ گی کیا۔ جتنا مال پولیس سے لینا ہے وہ مجھ ہی سے لے لو۔"

"ڈاکو، ڈاکو کو گرفتار نہیں کرواتا۔"

"پھر کیا آخر؟"

"دونوں اکٹھے کام کریں"--

"اور پھر" جمعدار سنگھ ہنسنے لگا۔ "تم کیا کرو گی۔"

"جو کہو گے۔"

"اور معاوضہ؟"

"میرا ایک کام کر دینا۔"

"وہ میں اس کے بغیر بھی کر دوں گا۔" اور جمعدار سنگھ واپس چلا گیا۔

دوسرے روز وہ اکیلا دن کے وقت اسے ملنے آیا اور پھر یہ ملاقاتیں محبت میں بدل گئیں۔ لیکن جمعدار سنگھ کو حیرانی اس بات کی تھی کہ آخر وہ اس لڑکی کو عام لڑکیوں سے جدا کیوں تصور کرتا ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو اسے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اس نے کبھی تپلی بائی کو چھو کر بھی نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی اس کے سامنے جمعدار سنگھ کے دل میں کوئی ایسی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اسے اس لڑکی میں طوائفوں والی کوئی بات بھی نظر نہ آتی تھی۔

اور ایک روز---!!

اوما نے اسے اپنی کہانی سنا ڈالی۔ وہی کہانی جو جمعدار سنگھ کی تھی جو ستیل گھاٹی کے ہر مکین کی تھی۔ ظالم نے مظلوم سے زندہ رہنے کا حق چھین لیا اور مظلوم زیر زمین چلا گیا تاکہ اپنا حق ظالم سے واپس لے سکے۔ لیکن اوما کے المیے میں نہ جانے کونسی خصوصیت تھی کہ جس نے جمعدار سنگھ کو بھی رلا ڈالا۔ پھر ان کا معاہدہ طے پا گیا۔ دونوں کا دکھ جو ایک تھا لہٰذا دونوں ایک ہو گئے۔

ایک روز لوگوں نے سنا کہ تپلی بائی بمبئی کے بازار حسن سے پراسرار طور پر غائب ہو گئی۔ جانے والے جانتے تھے کہ اس کی دوستی ایک بہت بڑے ڈاکو سے ہو گئی جو اسے بھگا کر لے گیا تھا۔

بمبئی کا بازار حسن سونا پڑ گیا۔ تپلی بائی کیا گئی تمام رونقیں بھی اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ جانے کتنے دل اس کے یہاں سے چلے جانے پر تڑپ کر رہ گئے۔ تپلی بائی یہاں سے بہت دور آسام میں چلی گئی تھی۔

ستیل گھاٹی کی مخلوق نے ایک مظلوم کے اضافے پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ اسے بڑی فراخدلی سے اپنے دامن میں پناہ دے دی گئی۔ یہاں تِلّی بائی نے عورت کا لبادہ اتار پھینکا۔ وہ مرد بن گئی تھی مکمل مرد۔ وہ اتنی تیزی سے اور پھرتی سے گولیاں چلاتی تھی کہ خود جمعدار سنگھ بھی حیران رہ جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھارت کے بڑے شہر اس کے نام سے گونجنے لگے۔ اخبارات نے اس کی مظلومیت کے قصے الاپنے شروع کر دیئے۔ وہ دن دیہاڑے اتنی دلیری سے ڈاکہ ڈالتی اور غائب ہو جاتی تھی کہ پولیس چکرا کر رہ جاتی۔

لوگوں کو حیرانگی اس بات کی تھی کہ آخر اسے ڈاکو بننے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔ وہ تو خود لاکھوں میں کھیلتی تھی۔ پولیس دن رات شکاری کتوں کی طرح اس کا پیچھا کر رہی تھی لیکن بے سود آج وہ آسام میں تھی تو دوسرے دن مدراس اور اس سے اگلے روز کلکتہ -- سفید کپڑوں میں ملبوس سی۔ آئی۔ ڈی کے خاص دستے دلی سے منگوائے گئے تھے۔ لیکن وہ عورت پھر بھی دن دیہاڑے للکارتی پھر رہی تھی۔

اور ایک روز -- اس کی سالوں کی تپسیا رنگ لے ہی آئی۔ آج اسے اپنے ازلی دشمن پر وار کرنے کا پہلا موقع ملا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ شاید ریہرسل ہی کرتی رہی تھی۔ آج اس نے جی بھر کے اپنے ارمان نکالنے تھے۔ پنڈت دواکار داس کی لڑکی بملا دیوی کی آج شادی تھی۔

پرکاش کی بہن کی شادی۔ نہ جانے کب سے وہ ان لمحوں کی منتظر تھی۔

شہنائی گونج رہی تھی۔ ڈھولک بج رہی تھی۔ تمام حویلیوں کو آج دلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ پنڈت دوارکا داس کی بیٹی کی شادی تھی۔ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ سارے ناگری کی رونق یہاں امنڈ آئی تھی۔ دوارکا داس اور منشی مہنگا مل دوڑے دوڑے پھر رہے تھے۔ بارات آگئی تھی!

شہنائی کا نغمہ تیز ہوتا جا رہا تھا۔ ہون ہونے لگا۔ پنڈت آسون پر بیٹھے اشلوک پڑھ

رہے تھے۔ آگ جل رہی تھی۔ دھوف کا دھواں اور زعفران، سیندور اور گلاب کی پتیاں، گنگا جل اور گھی کا جلتا ہوا چراغ رکھا تھا۔ لڑکیاں ڈھولک پر بیاہ شادی کے گیت گا رہی تھیں۔

پھر پنڈت رام سروپ نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ بملا اور اس کا پتی ایک دوسرے کا دامن تھامے آگ کے گرد چکر لگانے لگے تھے۔

پنڈت اشلوک پڑھ رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ صرف ہون میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی تھیں یا گھی کے جلنے کی- پنڈت اب آخری اشلوک پڑھ رہے تھے جس کے بعد چندن، زعفران، سیندور، گلاب جل اور چاول کا ٹیکا لگایا جاتا ہے!

اچانک ہی سامنے کا دروازہ کھلا اور پانچ چھ آدمی بڑی چادریں اوڑھے اندر گھس آئے۔

"کون ہے؟ کیا بات ہے؟ کیا لینے آئے ہو؟" پنڈت دوارکا داس نے گھبرا کر ان سے کتنے ہی سوال کر ڈالے۔

"تمہاری خوشیوں میں شرکت کرنے آئے ہیں دوارکا داس!" ایک آواز بلند ہوئی۔

"تِلّی بائی۔" کئی سرگوشیاں ابھریں۔

"مجھے غور سے پہچان ذلیل کتے۔" تِلّی بائی نے نقاب نوچ کر پرے پھینک دیا تھا۔

"اوما۔" دوارکا دس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اوما ہاتھ میں سٹین گن تھامے شعلہ جوالہ بنی کھڑی تھی۔

"ہاں اوما۔ وہی اچھوت لڑکی جو تمہاری دانست میں مر چکی ہے۔"

"اوما!" پنڈت دوارکا داس اس کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ ساری محفل پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ دولہا اور دلہن بت بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پنڈتوں کے اشلوک کہیں کھو گئے تھے ایک پرکاش تھا جو کسی طرح جان بچا کر کھسک گیا تھا اور نہ اس کے ساتھیوں نے

ہر طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔

"ذلیل کمینے" اس نے دوارکاداس کو نفرت سے ٹھوکر ماری۔

"موت کے خوف سے ایک اچھوت لڑکی کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہے۔ میں نے بھی جوڑے تھے میرے باپ نے بھی جوڑے تھے۔ لیکن تم نے ان پر ترس کھایا تھا کیا؟"

"اوما۔ بھگوان کے لئے مجھے مار ڈالو لیکن......"

"بکواس بند کر کتے۔" وہ پھٹ پڑی۔

"میرے باپ نے بھی تم سے یہی کہا تھا- ماسٹر جی نے بھی کہا تھا- لیکن تم نے ان سب کو مار ڈالا۔ بزدل براہمن تو آج نہیں مرے گا تجھے اپنے خاندان کا آخری انتقام دیکھنے کے لئے ابھی زندہ رہنا ہوگا۔ آج تو اوروں کی باری ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس کی سٹین گن کی لمبی سرخ زبان بملا کے شوہر کو چاٹ گئی۔

پنڈت دوارکاداس کے دونوں بازو کاٹ دیئے گئے تھے وہ ایک طرف بے ہوش پڑا تھا۔ پھر منشی مہنگا مل کو اس کے سامنے لایا گیا۔ موت کے خوف نے اس کی آدھی جان پہلے ہی نکال دی تھی۔ اوما نے اسے اذیتیں دے دے کر مارا اس کے دونوں ہاتھ اور بازو کاٹ کر سلگتے ہوئے ہون میں پھینک دیا گیا۔ پنڈت رام سروپ کو بھی انہوں نے مار ڈالا۔ پھر اس کے اشارے پر براہمنوں کی حویلیوں کو اس کے ساتھیوں نے نذر آتش کرنا شروع کر دیا۔

ناگری پر وہ رات قیامت بن کر ٹوٹی۔ براہمنوں کے قریباً سبھی سرکردہ لوگ مارے گئے لیکن پرکاش کسی نہ کسی طرح جان بچا کر نکل گیا۔ اوما نے پرکاش کے باپ کو جس حالت میں چھوڑا تھا صبح تک وہ اسی حالت میں سسکتا رہا بالآخر مر گیا۔ ناگری کے اچھوت اس کی مدد کو نہ آئے۔

اس واردات کی بازگشت اخبارات سے نکل کر صوبائی اسمبلی کے ایوانوں میں بھی

گونجی، ناگری میں "انکوائری کمیشن" آیا۔ اس کی رپورٹ پر اور اچھوتوں کے مسلسل احتجاج کے بعد حکومت نے پنڈت پرکاش کے بھی وارنٹ جاری کر دیئے۔

پنڈت پرکاش خود بھی یہی چاہتا تھا کہ کچھ عرصہ "حکومتی حفاظت میں گزار دے۔ کیونکہ پتلی بائی دیوانوں کی طرح اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ جیل پہنچ کر پرکاش اپنی دانست میں محفوظ ہو چکا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اوما اب وہ معمولی سی اچھوت لڑکی نہیں۔ ڈاکو ہے-- اور اس سے بھی زیادہ مکار۔

ایک روز کانپور جیل کے دروازے پر رات گئے فوج کی ایک جیپ آکر رکی۔ قیدیوں کی گنتی بند ہو چکی تھی اور سپرنٹنڈنٹ اپنے گھر آرام کر رہا تھا۔ جیپ میں تین مسلح فوجی اور ایک کیپٹن موجود تھا۔ کیپٹن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سے اس کے دفتر میں ملا اور ایک "خصوصی کاغذ" نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس سرکاری کاغذ پر انسپکٹر جنرل پولیس نے سپرنٹنڈنٹ کو حکم دیا تھا کہ وہ ایک معاملے کی تفتیش کے لئے "پنڈت پرکاش" کو فوج کے حوالے کر دے اور اس واقعے کی کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دے۔ یہ لوگ اسے اگلے روز رات گئے واپس کر جائیں گے۔ کاغذ کے اوپری حصے پر حکومت کی خصوصی مہر ثبت تھی اور سرخ سیاہی سے "انتہائی خفیہ" کے الفاظ لکھے گئے تھے۔

کیپٹن کے انداز تخاطب ہی سے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سہم کر رہ گیا۔ فوجی افسر نے اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی مہلت نہ دی اور "کاغذی کارروائی" مکمل کروا کر حیران پریشان اور بوکھلائے پنڈت پرکاش کو ان کے حوالے کر دیا۔ آندھی کی طرح یہ لوگ آئے تھے اور طوفان کی طرح واپس چلے گئے۔

پنڈت پرکاش کے کسی بھی سوال کا جواب انہوں نے جیل میں دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے اپنے وکیل سے فون پر بات کرنے کی اجازت مانگی تو کیپٹن نے اس کے منہ

پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ڈپٹی سمجھ رہا تھا کہ معاملہ خاصا سنگین ہے۔ پرکاش کو وہ لوگ آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر لے آئے اور ابھی جیپ میل ڈیڑھ میل دور ہی گئی ہو گی کہ ایک ندی کے نزدیک وہ لوگ رک گئے جہاں ایک اور جیپ ان کی منتظر تھی۔

پرکاش کو انہوں نے دوسری جیپ والوں کے سپرد کر دیا اور خود واپس چلے گئے جب اس کی آنکھوں سے پٹی اتاری گئی تو اس نے خود کو ایک کمرے میں بند پایا جس کے دروازے پر دو مسلح نگہبان کھڑے تھے۔ جب پرکاش کی آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس نے شدت سے خواہش کی کہ وہ اندھا ہی ہو جاتا یہ منظر دیکھنے سے پہلے اس کے سامنے اوما کھڑی تھی۔

قہر کی دیوی "پتلی بائی" بن کر---!

"تم"- دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔

"ہاں" اوما کا قہقہہ بلند ہوا- "غور سے دیکھ مجھے پنڈت پرکاش...... دیکھ مجھے......" وہ رعد کی طرح کڑکی۔

"اوما بھگوان کے لئے- اب تو میرا سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ معاف کر دو مجھے۔" وہ گھگھیایا اور بزدلوں کی طرح رونے لگا۔

"بکومت"- قہر کی دیوی دھاڑی۔ "تم جیسے مکروہ انسانوں کا بوجھ جب تک اس دنیا پر رہے گا مجھ ایسی ڈاکو لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں گی اور میں نہیں چاہتی کہ میرے بعد کوئی اچھوت لڑکی میری طرح تباہی کے راستے پر چلے۔"

پرکاش نے چاہا کہ اس کے پاؤں چھو کر معافی مانگے لیکن منہ پر لگنے والی زوردار ٹھوکر نے اسے الٹا کر پرے پھینک دیا۔ اوما کے ہاتھ میں پکڑے کوڑے میں جیسے بجلی بھر گئی ہو۔

اگلے روز علی الصبح ناگری کے لوگوں نے دیکھا پنڈت پرکاش نیم مردہ حالت میں

گاؤں کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں نکال دی گئی تھیں۔ بازو کٹے ہوئے تھے اور جسم کے بند بند پر اذیت کے نشان نمایاں تھے۔ پولیس کے اس تک پہنچنے سے پہلے وہ زندہ ضرور تھا لیکن جب اس کا منہ کھولا گیا تو زبان کٹ چکی تھی۔

وہ پولیس کو کچھ نہ بتا سکا۔ نہ ہی ڈاکٹر اس کے تن مردہ میں جان ڈال سکے۔ اس انتقام کے بعد شاید اوما کی کہانی مکمل ہو چکی تھی۔ کسی نے اس کے بعد "پتلی بائی" کا نام نہیں سنا۔ جمعدار سنگھ پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ لیکن "پتلی بائی" پولیس کو ہزار کوشش پر بھی نہ ملی۔ کبھی کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ اسے فلاں جگہ کسی خانقاہ پر دیکھا گیا۔ لیکن پولیس کے وہاں پہنچنے پر علم ہوتا کہ وہ کوئی اور تھی۔ پتلی بائی نہیں تھی۔

احتجاج

فائرنگ تھم گئی تھی-!

پچھلے پندرہ بیس منٹ سے اس کے تعاقب میں لپکنے والے شعلے سرد پڑ چکے تھے، لیکن ابھی تک اس نے اپنا سر گھٹنوں سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اس کی حالت ایسے چور کی سی ہو رہی تھی، گاؤں کے تمام کتے جس کو پھاڑ کھانے کے لئے بے قرار ہوں۔

گزشتہ پندرہ روز سے ایک دن بھی تو سکون سے نہیں گزرا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے اسی طرح اچانک وہ سیکورٹی فورسز کے گھیرے میں آ جاتا تھا۔ اس کی خوش قسمتی تھی، یا حسن اتفاق کہ اب تک وہ سیکورٹی سے بچا ہوا تھا۔ آج بھی پچھلے دس گھنٹے سے اس نے یہاں گاؤں کے باہر اپنے ایک دوست کی حویلی میں پناہ لے رکھی تھی۔ شام ڈھلنے پر اس نے واہگورو کا شکر ادا کیا کہ اب رات سکون سے گزرے گی لیکن کسی مقامی مخبر کو اس پر شک ہو گیا تھا اور اس نے نزدیک ہی موجود سی آر پی کی پوسٹ پر اطلاع کر دی۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی اور آنے والوں کی بد بختی کہ وہ جیپوں میں بیٹھ کر یہاں آئے اور انہوں نے گاؤں کو گھیرے میں لے کر ہوائی فائرنگ شروع کر دی جس نے حوالدار کرمجیت سنگھ کو ہوشیار کر دیا۔ وہ اپنی گن سمیت یہاں سے نکل جانے میں

کامیاب ہو گیا۔ کیونکہ وہ تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ شاید اسی لئے پولیس نے اس کے نزدیک جا کر اسے پکڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور پہلے گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی اور اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وہ نکل گیا اور کھیتوں کے بیچوں بیچ بھاگتا دریا کے کنارے بڑے بڑے سرکنڈوں میں چھپ کر بیٹھ رہا۔

اس کے تعاقب میں آنے والے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے لیکن اس کے تربیت یافتہ اور حساس کانوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان لوگوں کو ابھی تک اس کی سمت کا بھی علم نہیں ہو سکا اور وہ خواہ مخواہ اسلحہ پھونک کر اسے خوفزدہ کرنا چاہتے ہیں۔ سرکنڈوں کے عین درمیان پہنچ کر وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اپنی گن اس نے راؤنڈز سے بھرے تھیلے سمیت گود میں رکھ لی اور سر نیچا کر کے بیٹھ رہا۔

سرکنڈوں کے باہر وہ رک کر فائرنگ کرنے والے عام سپاہی تھے اور کرمجیت سنگھ اندازہ کر سکتا تھا کہ فائرنگ کرتے ہوئے بھی ان کے ذہنوں میں اس کا خوف مسلط تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اپنی تربیت کے بل بوتے پر ان میں سے ایک کو بھی زندہ نکل جانے کا موقع نہ دیتا۔ لیکن نہ جانے کیا سوچ کر اس نے وہیں دبک کر بیٹھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ شاید اسے ان رنگروٹوں پر رحم آ رہا تھا جو اپنی تربیت مکمل کرتے ہی قربانی کے بکرے بنا کر یہاں پنجاب میں بھیج دیئے گئے تھے۔

پندرہ بیس منٹ تک اسلحہ پھونکنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ کرمجیت سنگھ نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ برسات کی رات تھی۔ پچھلے دو روز سے بارش کچھ تھمی ہوئی تھی۔ لیکن آج سر شام ہی بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پر اٹکھیلیاں کرنے لگی تھیں اس نے آسماں کی طرف دیکھا جو بادلوں سے ڈھک چکا تھا- چاند کسی بادل کی اوٹ سے سکڑا سہا کبھی کبھی باہر جھانک لیتا تو فضا قدرے روشن ہونے لگتی۔

قریباً آدھ گھنٹہ وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا۔ پھر نپے تلے قدموں سے دریا کی طرف روانہ ہوگیا۔ دریا کے کنارے پر رک کر اس نے تڑپتی بل کھاتی لہروں پر نظریں گاڑ دیں کچھ ایسا ہی طوفان اس کے اندر بھی کب سے اٹھ رہا تھا۔ دریا اپنے کناروں سے باہر آنے کے لئے بے چین تھا۔ برسات نے اس کی طغیانیوں کو نیا جوبن عطا کر دیا تھا۔ اسے یاد آگیا جب وہ آخری مرتبہ اپنی کمپنی کے ساتھ ٹرین میں اس بیاس کے پل پر سے گزرا تو دریا بالکل سوکھا پڑا تھا۔ کہیں پانی جوہڑوں کی شکل میں جمع نظر آتا تھا جس میں نزدیکی دیہاتوں کی گائیں اور بھینسیں بمشکل اپنا آپ بھگو رہی تھیں۔

ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر اس نے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ پتلون کے پائنچے چڑھالئے اور پاؤں گیلی ریتلی زمین پر رکھ دیئے۔ خیالات کا ایک جوار بھاٹا اس کے اندر بڑی تیزی سے اٹھا اور اسے بہا کر یہاں سے کچھ دور گورداسپور کے ایک سرحدی علاقے میں واقع اس کے گاؤں میں لے گیا۔

کرجیت سنگھ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور پیدائش پر اسے دشمنی ورثے میں ملی تھی۔ جس خاندان سے اس کا تعلق تھا اس کے آٹھ اور مخالفوں کے دس آدمی مارے جا چکے تھے۔ دونوں کا جیلوں میں آنا جانا لگا ہی رہتا تھا۔ لیکن مکھن سنگھ نے اپنے بیٹے کو کبھی تتی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ اس کے بھائی اسے اکثر بزدل ہونے کا طعنہ دیتے کہ وہ اپنے بیٹے کو ہندو باپ کی طرح پال پوس رہا ہے۔ لیکن مکھن سنگھ نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی۔ اکثر وہ کرجیت کو اپنے ساتھ ہی رکھتا۔ گاؤں کے گوردوارے کا گرنتھی شام کے بعد اس کے ڈیرے پر ہی کرجیت کو آکر کچھ پڑھا لکھا جاتا-- وہ اپنی اکیلی "سنتان" کی زندگی کی خطرہ مول لینے کے لئے کبھی تیار نہ ہوا۔

جب برادری کے طعنے بہت بڑھے تو اس نے کرجیت کو دل پر پتھر رکھ کر فوج میں بھرتی کروادیا اور برادری کو یہی بتایا "چھندر اس طرح رائفل چلانا سیکھ جائے گا"--!

کرجیت 70ء کے آغاز میں بھرتی ہوا۔ اس کا قد کاٹھ دیکھ کر کوئی بھی اس کی عمر کے متعلق اندازے کی غلطی کا شکار کر سکتا تھا۔ ریکروٹ سنٹر میں دوران تربیت ہی اسے دوسرے ریکروٹوں سے الگ کر کے خصوصی کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی اور تربیت مکمل ہوتے ہی مشرقی پاکستان روانہ کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان میں ان دنوں بھارتی مداخلت اپنے عروج پر تھی اور بھارتی مداخلت کار کھلے بندوں اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ان کی مدد کے لئے بھارتی افواج سرحدوں کے ساتھ ساتھ بڑی تیزی سے مورچہ بند ہو رہی تھیں تاکہ اشارہ ملتے ہی لڑائی کا بازار گرم کر دیں۔ تب کرجیت کو سیاست کی الف بے کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ خود کو "مہاویر" سمجھ کر بھارت ماتا کی "رکھشا" کرنے یہاں آیا تھا۔ اسے یہی تربیت دی گئی تھی کہ مسلمانوں نے ان کے گوروؤں کو مار ڈالا تھا۔ مغلوں نے سکھوں کے ساتھ بڑے ظلم کئے تھے اپنی مذہبی تعلیمات کی رو سے اسے مسلمانوں پر کبھی اعتبار نہیں کرنا تھا۔

جنگ شروع ہوئی تو وہ اپنی کمپنی کے ساتھ مختلف محاذوں پر برسرپیکار رہا۔ مذہبی جنون اور اسی پروپیگنڈہ کے زیر اثر جس کا وہ اب تک شکار رہا تھا اس نے ہر محاذ پر داد شجاعت دی اور بڑھ بڑھ کر "مسلمان فوج" پر حملے کرتا رہا۔

جنگ کے خاتمے پر اسے پاکستانی قیدیوں کی ایک ٹرین کے ساتھ آسام کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ اسے آج ایک مسلمان فوجی کی کہی وہ بات بڑی شدت سے یاد آ رہی تھی جسے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکنے کی کوشش کرنے پر ڈانٹ دیا تھا۔ فوجی نے اس کی طرف بڑے تمسخر سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

سردار جی! ہماری اور ہندو کی جنگ تو ہزار سال سے جاری ہے اور جانے کب تک چلتی رہے گی۔ یہ ہار جیت بھی لڑائی کا حصہ ہے۔ ہم اپنے دین اور وطن کی عظمت کے لئے لڑتے ہیں اور ہندو اپنے ملک کے لئے۔ لیکن تم ہمارے بیچ کیوں آگئے ہو۔ تم ابھی

بچے ہو۔ میری بات سمجھ نہیں سکو گے۔ ممکن ہے ہم سے بچ جاؤ لیکن ہندو تمہیں کبھی نہیں چھوڑے گا۔ یہ اپنی فطرت کے مطابق تمہیں ضرور ڈسے گا۔ پھر تمہاری اپنی پہچان ہے بھی کیا؟"

آج دریائے بیاس کے کنارے اپنے پاؤں پانی میں لٹکا کر بیٹھا کرمجیت سوچ رہا تھا۔ واقعی اس کی پہچان کیا ہے؟ اسے رہ رہ کر ایک ہی پچھتاوا ڈس رہا تھا کہ آج سے 14 سال پہلے اس نے مسلمان فوجی کی بات کا مطلب کیوں نہ جان لیا۔

"کرمجیت سیہاں"۔ کوئی اس کے اندر سے پکارا۔ "مچھلی پتھر چاٹ کر ہی واپس مڑتی ہے۔"

تب شاید اسے اتنا شعور ہی نہیں تھا کہ برے بھلے کی تمیز کر سکتا یا پھر وہ اپنی سطح سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ جنگ کے خاتمے پر اسے بہادری کے اعزاز سے نوازتے ہوئے خصوصی کمانڈو ٹریننگ کے لئے بھیج دیا گیا۔

جب وہ ٹریننگ حاصل کر کے واپس لوٹا تو مکمل کمانڈو اور لانس نائیک بن چکا تھا۔ اپنی یونٹ میں وہ کبڈی کا بہترین کھلاڑی گنا جاتا تھا۔ جب کبھی چھٹی پر کرمجیت گاؤں جاتا اس کا والد اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر ہی اسے لینے آجاتا۔ وہ اپنے بیٹے کی زندگی کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

اس نے کبھی اپنی دشمنی کی ہوا بھی کرمجیت کو نہ لگنے دی۔ اکثر مواقع پر اس کے بھائی کرمجیت کو بھڑکانے کی کوشش کرتے اور اس کی غیرت کو للکار کر اسے بدلہ لینے پر تیار کرتے۔ لیکن اس کا باپ مکھن سنگھ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر سے آتا۔

اس نے اپنے بھائیوں کو صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ان کی لاکھ خواہش کے باوجود اپنے بیٹے کو جلتی ہوئی آگ میں نہیں پھینکے گا۔"

خود کرمجیت بھی اپنے والد کے جذبات کا احترام کرتا۔ پھر وہ خود کو فوجی ہونے کے

ناطے بھی ان سے الگ تھلگ کوئی چیز سمجھتا تھا۔ اسے اپنا مستقبل خاصا روشن دکھائی دیتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں سے آگے نکل جائے گا۔ بریگیڈ کمانڈر پرکاش مہرہ نے بھی دو تین مرتبہ اسے خود طلب کر کے شاباش دی تھی--!

کرمجیت اپنے باپ کی خواہش کا احترام ضرور کرتا اگر اس نے ستوندر کور کو نہ دیکھا ہوتا۔ ایک روز جب وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے کرپان ہاتھ میں تھامے اپنے گاؤں کے باہر پکی سڑک کی طرف لاری پر بیٹھ کر شہر جانے کے لئے جا رہا تھا تو کھیتوں کی ایک منڈیر کو عبور کرتے ہوئے ستوندر کور اچانک ہی اس کے سامنے آگئی۔ کرمجیت اپنے خیالوں میں مگن چلا جا رہا تھا اس کے کمپنی کمانڈر نے اس کے نائیک ہونے کی سفارش کے کاغذات ہیڈ کوارٹر کو بھیج رکھے تھے اور وہ سوچتا اور مسکراتا ہوا لاری اڈے کی طرف جا رہا تھا۔ کہ جب چھٹی کاٹ کر یونٹ میں پہنچے گا تو اس کے نائیک ہونے کے آرڈرز بھی آچکے ہوں گے۔

اچانک ہی جب ستوندر کور اس کے سامنے آئی تو ایک زور دار جھٹکے سے اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ ستوندر کور بھی کھیتوں کے بیچوں بیچ بھاگتی ہوئی آرہی تھی۔ ایک دوسرے کو اچانک آمنے سامنے پا کر دونوں ہی ٹھٹھک کر رہ گئے--!

اپنے دشمنوں سے کرمجیت کا براہ راست ٹکراؤ نہیں ہوا تھا۔ لیکن ایسی بات بھی نہ تھی کہ اب وہ حاکم سنگھ کی بیٹی کو نہ پہچانتا۔ دونوں نے اپنا بچپن اکٹھے ان ہی پگڈنڈیوں پر بیتایا تھا۔ وہ تو گردش حالات تھی جس نے دونوں کو کھینچ کر الگ کر دیا تھا اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بھی تان دی تھی جس کے آرپار جھانکنا ہی دونوں کے لئے ممکن نہیں رہا تھا۔

"ست سری اکال۔" پہل ستوندر کور ہی نے کی۔

"جے ہند"-- کرمجیت نے اپنے خول سے باہر نکلنا پسند نہ کیا۔

"اونہہ! رہا وہی فوجی کا فوجی"--- ستوندر کور نے کہا اور ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

کرجیت کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے سوچا واقعی اسے کبھی کبھی عام انسان بھی بننا چاہئے لیکن برا ہو اس کی تربیت کا جس نے اسے کمانڈو بنا دیا تھا اور ہر وقت وہ خود کو آن ڈیوٹی ہی محسوس کرتا تھا۔

ستوندر کو اس نے کم و بیش آج چار پانچ سال کے بعد دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس کے خاندانی دشمن حاکم سنگھ کی بیٹی تھی، لیکن کرجیت نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی طرح ستوندر کور بھی ان دشمنیوں کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ اس نے ملاقات پر کسی ناخوشگوار تاثر کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے سلام کا جواب حسن انداز سے کرجیت نے دیا اس پر نہ جانے ستوندر کیا سوچتی ہوگی؟ یہی کچھ سوچتا وہ لاری اڈے کی طرف چل دیا۔

شام گئے وہ جب واپس گاؤں لوٹا تو کھیتوں کے سلسلے میں اسی موڑ پر ایک مرتبہ پھر ستوندر سوال بن کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اب وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ یہ اندازہ ہی نہ کر پاتا کہ یہ ملاقات "اتفاقی" نہیں۔

صاحب سلامت کا سلسلہ طے کرنے پر جب اس نے قدم آگے بڑھایا تو ستوندر نے اپنا بازو اس کے سامنے کر کے رکنے کا اشاہ کیا!--

"دشمنی تمہارے اور میرے باپ کی ہے میری اور تمہاری نہیں"-- پنجابی جٹی کی آواز پر پچھتاوے یا تاسف کا گمان قطعاً نہیں ہوتا تھا۔

"گاؤں میں کسی نے مجھے اور تمہیں بات کرتے دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی"-- اس نے فرار چاہا۔

"مجھے پرواہ نہیں کسی بھی قیامت کی۔ میں نہیں ڈرتی کسی سے-- اور تم-- تم فوجی ہو کر اتنے بزدل کیوں ہو۔ میں نے سنا تھا کہ تمہیں بہادری کا تمغہ بھی ملا ہے--

تمہاری ترقی ہوگئی ہے۔ تم ڈرتے کیوں ہو؟"

ستوندر اس کے بارے میں اتنی باخبر ہے کہ کرجیت کے لئے یہ سوچ بھی بڑی خوشگوار تھی۔

"میں ڈرتا نہیں ہوں"-- اس نے جاٹ سکھوں کے مخصوص لہجے میں کہا-- "بس یونہی جھگڑے میں پڑنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کس نے کہا ہے تم سے اس جھگڑے میں پڑنے کو۔ ختم کر دو یہ جھگڑا۔" ستوندر نے اپنا بازو اس کی طرف بڑھا دیا۔

کسی لاشعوری عمل کے تابع اس نے ستوندر کا بازو پکڑ لیا۔ اسے بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔

"اب مرد بننا۔ اگر بازو تھاما ہے تو اسے چھوڑنا نہیں۔" ستوندر نے پھر اس کی مردانگی کو للکارا۔

"یہ ایک سکھ کا وچن ہے ستوندر۔ میں اگر شادی کروں گا تو تم سے-- ورنہ اور کسی سے نہیں۔" اس کی بات مکمل ہوتے ہی کھیتوں میں سرسراہٹ ہوگی۔ دونوں چونکے شاید کوئی اسی طرف آرہا تھا۔

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔ نہ آئے تو زہر پھانک لوں گی"-- ستوندکور نے اپنے بازو پر سے اس کا ہاتھ آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا اور وہ جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی اسی طرح غائب بھی ہوگئی۔

ساری رات کرجیت نے کروٹوں کی نذر کر دی۔ کیا مجال جو ایک پل کے لئے بھی اس کی آنکھ لگی ہو۔ اسے ستوندر کے چلے جانے کے بعد احساس ہوا تھا کہ نادانستگی میں کیسا وچن اس نے ستوندر کو دے دیا ہے۔ حاکم سنگھ کے جیتے جی اس کی اکلوتی بیٹی سے شادی۔ یہ بات تو سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اچھی بھلی گزر رہی تھی۔ ستوندر نے

اچانک ہی اس کا بچپن اس کے سامنے زندہ کر دیا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ ستوندر کے ساتھ کھیلنا۔ دونوں کا اکٹھا مل کر گھر اور گڑیاں بنانا۔ اب تو حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ آج تک اسے کبھی ستوندر کا خیال اس شدت سے آیا کیوں نہیں؟

کرمجیت نے جو کہا کر کے دکھا دیا--!

تین چار ماہ بعد جب بھی وہ چھٹی پر آتا ستوندر سے ضرور ملتا۔ دونوں نے اپنی ملاقاتوں کے لئے رابطہ تلاش کر لیا تھا۔ سانسیوں کی مائی منگتی کا گاؤں کے ہر گھر میں آنا جانا تھا۔ اس کے ذریعے دونوں کے پیغامات ایک دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے۔

بات منہ سے نکلی اور شہر میں پھیلی۔ ستوندر کو کرید کر جیتو نے اس سے کرمجیت کی محبت کا اقرار کروا ہی لیا۔ اگلے ہی روز حاکم سنگھ خونخوار آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے موجود تھا-!

"بے غیرت - تجھے لاج نہ آئی۔ دشمن کے بیٹے سے ملتی ہے۔ تیرا شیر جیسا بھائی اس کے ماموں نے مار ڈالا تھا۔ آج زندہ ہوتا تو......" حاکم سنگھ کی آواز بھرا گئی۔ اسے اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا جسے کرمجیت کے ماموں نے بٹالہ کچہری میں سب کی آنکھوں کے سامنے گولی مار دی تھی۔

"باپو! اس میں کرمجیت کا کیا قصور۔ وہ تو کبھی لڑائی جھگڑے میں آیا ہی نہیں۔ اس کے باپ نے بھی کبھی حصہ نہیں لیا۔ بس یہی گناہ ہے ان کا کہ وہ ہمارے دشمنوں کے رشتہ دار ہیں۔"

"زبان بہت چلانے لگی ہے تو - اکیلی سنتان ہے نا ورنہ تیرے ٹکڑے کر کے ابھی مکھن سنگھ کے گھر کے سامنے پھینک آتا۔ آج کے بعد اگر گھر سے پاؤں باہر نکالا تو......

حاکم سنگھ غصے میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔

دروازے پر اس کی ملاقات گیانی کرپال سنگھ سے ہو گئی-!

"واہے گورو جی کا خالصہ۔ واہے گورو جی کی فتح۔" اس نے گیانی کرپال سنگھ کو دیکھتے ہی "فتح" بلائی۔

"کیا بات ہے حاکم سیہاں۔ بڑے پریشان نظر آ رہے ہو۔" گیانی نے "فتح" کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"کیا عرض کروں گیانی جی!" حاکم سنگھ کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں کی کہے۔

"ادھر آؤ میرے ساتھ۔" بوڑھے گیانی نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں گوردوارے میں آ گئے۔ حاکم سنگھ گیانی جی کا دل سے احترام کرتا تھا۔ سارا گاؤں ہی ان کا عقیدت مند تھا۔ کیونکہ گیانی نے کبھی کوئی غیر مذہبی بات نہیں کہی تھی۔ کوئی غیر اصولی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ خود اچھا بھلا زمیندار تھا لیکن "گودگھر" کی محبت میں وہیں کا ہو رہا۔ گاؤں کی پنچائیت میں اس کا خاصا رسوخ تھا اور آج تک وہ کسی کے سامنے جھکا نہیں تھا۔ اس کی یہی خوبی اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔

"میں جانتا ہوں حاکم سیہاں! تم مجھ سے کیا چھپاؤ گے۔ لیکن میری ایک بات غور سے سن لو۔ واہگورو نے تمہیں ایک موقع دیا ہے سنبھلنے کا۔ اس قتل و غارت کو ختم کرنے کے لئے اگر تم سے کوئی نیک کام ہو جائے تو اس میں سبکی محسوس نہ کرنا۔ حاکم سیہاں! میری زندگی کا بھروسہ نہیں۔ لیکن میری ایک بات کان کھول کر سن لو - ہماری قوم پر بہت برا وقت آنے والا ہے۔ مجھے "گورو دسم پادشاہی" نے پرسوں درشن کروائے تھے۔ "کلغی دھر پادشاہ" نے مجھے بتا دیا ہے کہ "پنتھ" کی "چڑھدی کلا" کو خطرہ آیا کہ آیا - حاکم سیہاں نے ہندو نے ہم سے جو کام لینا تھا لے لیا۔ 47ء میں مسلمانوں کا قتل عام کروایا۔ اب سکھ فوجیوں سے پاکستان توڑنے کا کام لیا ہے۔

حاکم سیہاں توڑ پھوڑ کا عمل شروع ہو چکا ہے۔ اب ہماری باری بھی آئی - یاد رکھنا ہندو ہمیں معاف نہیں کرے گا کیونکہ اس نے محسوس کر لیا ہے۔ کہ اب سکھ قوم میں

اپنے تشخص کا شعور بیدار ہونے لگا ہے ہندو تمہیں "ہندوستانی بنو" کا درس دیتا رہے گا اور خود صرف "ہندو" بنتا جائے گا۔ حاکم سیہاں 47ء کی غلطی کا احساس آج مجھے ہو رہا ہے۔ رب کا واسطہ اپنی ذاتی دشمنیاں بھول کر اب پنتھ کی چڑھدی کلا کے لئے اکٹھے ہو جاؤ۔ میں نے کل مکھن سیہاں کو بھی یہی سمجھایا ہے وہ راضی ہے۔ تمہارے گھر آ کر رشتہ مانگے گا۔ تیری اکلوتی بیٹی ہے اور اس کا اکلوتا بیٹا-- تم دونوں اس دشمنی کے چکر سے نکل جاؤ--"

گیانی جی کے منہ سے پہلی مرتبہ حاکم سنگھ نے سیاسی گفتگو سنی تھی۔ اس سے پہلے اس نے گاؤں کے کچھ لڑکوں کو جو امرتسر سے آئے تھے دمدمی ٹکسال کے سنت جرنیل سنگھ کی باتیں کرتے سنا تھا۔ یہ نوجوان سنت جی سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئے تھے۔ گاؤں واپسی پر انہوں نے بتایا تھا کہ سنت جی انہیں "امرت دھاری" بنا دیا ہے۔ اور اب وہ ان کے حکم کے مطابق ہر وقت "شستر" لگا کر رکھیں گے۔

ان نوجوانوں کے لیڈر کو جو سکھ سٹوڈنٹس فیڈریشن سرگرم رکن بھی رہا تھا کل ہی سیکورٹی والے پکڑ کر لے گئے تھے۔ آج شام تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا کہ اسے کہاں لے جایا گیا ہے۔ بس سرپنچ کو مقامی تھانے کے منشی نے اتنا بتایا تھا کہ اسے سیکورٹی والے امرتسر لے گئے ہیں۔ اب اس کی واپسی قسمت سے ہی ہو گی۔

"مہاراج جی! میری مجال نہیں کہ آپ کی بات ٹال سکوں لیکن آپ تو جانتے ہیں گاؤں والے میرا جینا دوبھر کر دیں گے۔ مجھے بھی اس لڑائی جھگڑے سے اتنی ہی نفرت ہے جتنی مکھن سنگھ کو-- اور یوں بھی چندے کے مرنے کے بعد میرا اب رہا کون ہے یہاں- اس دشمنی نے میرا بیٹا بھی مجھ سے چھین لیا-- میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ اپنی بٹی کو بھی دکھی کروں۔ لیکن گیانی جی! آپ تو میری برادری کو جانتے ہیں ناں!"

"جہنم میں گئی تمہاری برادری حاکم سیہاں! میں نے مکھن سے بات کر لی ہے۔ تم

اپنا من صاف کر لو واہگورو کرپا کرے گا۔

پندرہ بیس روز بعد "گرپورب" کے روز گاؤں کے تمام لوگ بڑی حیرانی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے جب گیانی کرپال سنگھ نے ارداس کے خاتمے پر گوربخش سنگھ اور حاکم سنگھ کو بغل گیر کرواتے ہوئے دونوں کی زبانی اعلان کروا دیا کہ آج سے ستوندر اور کرمجیت پتی پتنی ہیں۔ دونوں کی منگنی کا اعلان وہیں کر دیا گیا۔ گیانی کرپال سنگھ نے ہی گاؤں والوں سے کہا کہ اگلی چھٹیوں پر فوجی کرمجیت سنگھ "پھیرے" ستوندر سے ہو جائیں گے--!

دونوں برادریوں پر یہ خبر بجلی بن کر گری--!

دونوں برادریوں نے حاکم اور مکھن کا ایک طرح سے سوشل بائیکاٹ ہی کر دیا لیکن وہ ذہنی طور پر کسی بھی ردعمل کے لئے تیار تھے۔ دوسری طرف ستوندر سے سگائی کی خبر نے جیسے کرمجیت کے جسم میں بجلیاں بھر دیں۔ اس نے کمانڈو کورس میں اپنے گروپ میں ٹاپ کیا اور ایک روز وہ بھی آ گیا جب کرمجیت سنگھ حوالدار بن کر گاؤں واپس لوٹا۔

حالات کا دھارا بڑی تیزی سے اپنا رخ بدل رہا تھا۔ کرمجیت دو چار محکمانہ امتحانات پاس کرنے کے بعد اب حالات کو سمجھنے بوجھنے لگا تھا۔ اس نے واضح طور پر محسوس کر لیا تھا کہ فوج میں ایک سازش کے تحت سکھوں سے نجات حاصل کی جا رہی ہے۔

جنرل شوبیگ سنگھ کو جسے بھارتی فوج میں "مکتی باہنی" کے ذریعے پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے کے ضمن میں ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔ مکھن سے بال کی طرح الگ کر دیا گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ اسے کوئی سینئر رینک دیا جاتا اسے فوج سے نکال دیا گیا-!

جس روز یہ اطلاع سکھ یونٹوں میں پہنچی اسی روز پہلی مرتبہ دوسرے سکھ فوجیوں کی طرح کرمجیت نے سوچا کیا ہماری قربانیوں کا یہی صلہ ہے؟ اس کے بعد سے تو یہ

سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شاید ہی کوئی سینئر رینک کا سکھ آفیسر بھارتی فوج میں باقی رہ گی ہو---ورنہ تو سب کو جبری ریٹائرمنٹ پر گھر واپس بھیج دیا گیا تھا۔

اسی دوران سکھوں کے مقدس مقام دمدمی ٹکسال کے گرنتھی سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کی شخصیت سکھ مصلح قوم کی حیثیت سے نمایاں ہونے لگی تھی۔ ان کی تقریروں کے کیسٹ چوری چھپے سکھ یونٹوں میں آنے لگے تھے لیکن جس کسی سے یہ کیسٹ برآمد ہو جاتا اسے سزا ملتی تھی- حوالدار کرمجیت سنگھ کو اس فیصلے سے بڑی الجھن ہوتی۔ وہ سوچنے لگتا کیا اپنے مذہبی رہنما کے خیالات سے استفادہ کرنا بھی جرم ہے؟

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان ایک دوسرے کو قتل کرنے کی مہم بھی شروع ہو گئی۔ سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ نے اپنے پیروکاروں کو تبلیغ کرنا شروع کر دی تھی کہ وہ سکھ روایات کے مطابق خود کو مسلح رکھیں اور فوجی تربیت حاصل کریں۔ انہیں ہندوؤں سے نجات حاصل کر کے بہر حال الگ ملک بنانا ہو گا۔ سنت جی نے اپنی قوم کے دلوں میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ اس آگ میں جہاں ہندو ذہنیت جھلسی وہاں اس کے شعلوں سے سکھوں کے گھر بھی محفوظ نہ رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے جعلی پولیس مقابلوں کی ایک لہر چل نکلی۔

آئے روز پنجاب کے اخبارات ایسی خبروں سے بھرے ہوتے تھے کہ فلاں جگہ جعلی پولیس مقابلے میں سکھ ڈاکو یا مفرور مارا گیا۔ حوالدار کرمجیت اپنی کڑمائی کے لئے جس روز چھٹی پر گاؤں آیا اس روز شام کو گیانی کرپال سنگھ اسے گھر پر ہی ملنے آ گیا۔ اس نے کرمجیت کو بتایا کہ نزدیک دور کے دیہاتوں میں اب تک قریباً بیس سکھ نوجوانوں کو جعلی پولیس مقابلوں میں ہندو پولیس نے مار ڈالا ہے۔

پیلی پگڑی باندھے ہوئے گیانی کرپال سنگھ نے اس روز حوالدار کرمجیت سنگھ سے کہا تھا۔ ”فوجی سیہاں! وہ بہت جلد آنے والا ہے۔ جب تم بھی یہی بسنتی پگڑی باندھ لو گے۔“

اگلے روز دونوں کی سگائی ہو گئی۔ کرمجیت اور ستیوندر کے کسی نزدیکی رشتہ دار نے اس تقریب میں شرکت نہیں کی تھی کیونکہ دونوں برادریاں اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھیں۔ لیکن نزدیک دور کے دیہاتوں میں شاید ہی دونوں کا کوئی ایسا جاننے والا ہو گا جس نے اس موقع پر خوشی کا اظہار نہ کیا ہو۔

اس سگائی سے کرمجیت اور ستوندر کی گودلی مراد بر آئی تھی۔ لیکن کرمجیت نے واضح طور پر محسوس کیا کہ لوگ بڑے خاموش، سہمے ہوئے اور ناراض نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی زبردستی ان سے ان کا اپنا پن چھین رہا ہو۔

اب وہ بچہ نہیں رہا تھا۔ اسے حالات کی سنگینی احساس ہونے لگا تھا۔ گاؤں میں ہونے والے واقعات پر اس کی نظر تھی۔ اسے علم تھا کہ کتنے نوجوانوں کو اب تک سیکورٹی والے تفتیش کے بہانے لے جا چکے تھے۔ اسے بسا اوقات غصہ بھی آتا لیکن فوجی ڈسپلن اب اس کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ اس کو سوچنے کی بھی مکمل آزادی نہیں تھی۔

اس مرتبہ حوالدار کرمجیت سنگھ کو ایک ہفتے کی چھٹی ملی تھی لیکن اسے امید تھی کہ دو تین ماہ بعد وہ اپنی شادی کے لئے ایک ماہ کی چھٹیاں لے لے گا۔ اس لئے اس کے باپو نے اس مرتبہ سگائی پر ہی اکتفا کیا تھا۔

بھوگپور کے مکینوں پر وہ رات قیامت ڈھا گئی جب اچانک ہی آدھی رات کے بعد بی ایس یف (بارڈر سیکورٹی فورس) نے سارے گاؤں کو گھیرے میں لے لیا اور ہوائی فائرنگ شروع ہو گئی۔ حوالدار کرمجیب سنگھ ہڑبڑا کر اٹھا اور اس نے چاہا کہ بھاگ کر باہر نکل جائے لیکن اس کا باپو دروازے میں دیوار بن کر بانہیں پھیلائے کھڑا تھا۔

”نہ بچہ“ تو سو جا- آرام کر- تجھے کیا جانے کیا معاملہ ہے- اس نے کرمجیت کو ہاتھ کے اشارے سے واپس جانے کو کہا۔

"باپو! مجھے دیکھنے تو دو" کرمجیت نے دوبارہ آگے بڑھتے ہوئے کہا اور اپنے باپو کا بازو آہستگی سے ہٹا کر باہر نکل آیا۔

گور بخش سنگھ بیٹے کے تعاقب میں باہر لپکا۔ باہر گلی میں گاؤں کے کچھ اور لوگ بھی جمع تھے۔ سب کا رخ گاؤں کے گوردوارے کی طرف تھا۔ فائرنگ کی آوازیں اب اسی سمت سے آرہی تھیں۔

گوردوارے سے پہلے ہی گلی کے خاتمے پر تمام لوگ رک گئے۔ گوردوارے کی بتیاں روشن تھیں اور انہیں سامنے کا منظر بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ گوردورے کو بی ایس ایف کے جوانوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ ہوائی فائرنگ کر رہے تھے۔ کرمجیت کا خون کھول اٹھا اس نے ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے نکلنا چاہا تو حاکم سنگھ اور گور بخش دونوں اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئے۔ کرمجیت کو سمجھ نہیں آرہی تھی کیا کرے؟ کیسے کرے؟

"ٹھہرو سب لوگ! میں دیکھتا ہوں"---سرپنچ کی آواز سنائی دی۔

وہ ہجوم میں راستہ بناتا گوردوارے کی طرف بڑھا۔ اپنی روایت کے مطابق کرپان اس کے ہاتھ میں پکڑی تھی۔ جیسے ہی وہ گوردوارے کے نزدیک پہنچا گھات میں لگے بی ایس ایف کے جوانوں نے اپنی رائفلیں سیدھی کیں اور گاؤں کے لوگوں نے دیکھا کہ گوردوارے کی سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی سرپنچ زمین بوس ہو گیا۔ کسی نے کسی طرح وہ گھسٹتا ہوا گوردوارے کی سیڑھیوں تک پہنچ ہی گیا تھا پھر اسے کروٹ لینے کی بھی مہلت نہ ملی---!

ہجوم پر دہشت طاری ہو گئی۔ غم و غصے سے لوگوں کا برا حال تھا۔ اچانک ہی گودوارے کے سپیکر چلانے لگا۔ گیانی کرپال سنگھ گاؤں والوں سے مخاطب تھا وہ انہیں کہہ رہا تھا۔ "رب کے واسطے کوئی اس طرف نہ آئے۔ یہ لوگ صرف میری جان لینا

چاہتے ہیں میرے ساتھ کوئی اور نہ مرے۔" اس کے ساتھ ہی "ارداس" شروع ہو گئی۔

"ارداس" کے آخر میں جب گیانی کرپال سنگھ نے "جے کارہ" بلند کیا تو سارا گاؤں اس کا ہم آواز تھا۔ لوگوں نے دیکھا گیانی جی ہاتھ میں ننگی کرپان لئے سر پر کیسری دستار سجائے گوردوارے سے برآمد ہوئے۔ وہ اونچی اونچی آواز میں "جپ جی" کا پاٹھ کر رہے تھے اس کے ساتھ ہی گولیاں چلنے لگیں۔ گھات میں لگے بی ایس ایف کے جوانوں کو شاید یہ حکم ملا تھا کہ زندہ کسی کو گرفتار نہ کرنا۔ دوسرے ہی لمحے گیانی کرپال سنگھ کا جسم بے جان ہو کر گوردوارے کی سیڑھیوں پر گر پڑا۔ خون ان کے جسم سے نکل کر سیڑھیوں پر پھیلنے لگا تھا۔

گیانی کے گرتے ہی بی ایس ایف کے جوان چھلانگیں لگا کر ٹرک میں بیٹھ گئے اور ٹرک گاؤں کی لہلہاتی فصلوں کو اپنے بڑے بڑے بے ہنگم ٹائروں تلے کچلتا تیزی سے پکی سڑک کی طرف بھاگنے لگا۔

وہ رات بھوگپور کے مکینوں پر بہت بھاری رہی۔ سارے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ گیانی کی موت نے نزدیک دور کے دیہاتوں کو رلا دیا۔ لوگ جوق در جوق اس طرف اُمڈے چلے آتے تھے۔ گیانی کے متعلق اس علاقے کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ وہ ایک امرت دھاری سکھ ہے اور دمدمی ٹکسال کا پیروکار۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا جا سکتا تھا۔

حوالدار کرمجیت سنگھ کا خون دوبارہ تب کھولا جب صبح اس نے اخبار کی چیختی چلاتی سرخیوں میں ایک خبر یہ بھی دیکھی۔

بھوگپور کا سرپنچ تیجا سنگھ اور گیانی کرپال سنگھ پولیس مقابلے میں مارے گئے۔ دونوں دہشت گرد اور پولیس کو متعدد مقدمات میں مطلوب تھے۔ گیانی کرپال سنگھ کے گاؤں کے لوگ غم و غصے سے باؤلے ہوئے جاتے تھے۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ ان

کے مقدس گوردوارے کی بے حرمتی ہوئی تھی- گاؤں کے دو معزز بزرگ بے گناہ مارے گئے تھے۔ ان کے دلوں میں موجود نفرت کی جڑیں اور گہری ہو گئیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ حکومت کے نزدیک "دہشت گرد" کون ہے؟

کرمجیت کے لئے اپنے جذبات پر قابو پانا بڑا مشکل تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جیسے بھی ممکن ہو گیانی اور سرپنچ کے قاتلوں سے بدلہ لے۔ لیکن اس کی سرکاری حیثیت کرمجیت کو ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

اگلی صبح گوردوارے سے گیانی کا نائب اپنے ساتھیوں کے ساتھ "بھجن کتا کر رہا تھا۔

جے تم پریم کھیلن کا چاؤ
سر دھر تلی گلی مورے آؤ

اشلوک نے کرمجیت کے دل میں آگ لگا دی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی گاؤں کی پنچائیت میں پہنچ جائے جہاں لوگ اکٹھے ہو کر ہند سرکار کی جان کا ماتم کر رہے تھے۔ سارا گاؤں نفرت کی زبان بنا ہندوؤں کو گالیاں دے رہا تھا۔ گاؤں کے باہر جانے والے تمام راستوں پر پولیس اور بی ایس ایف کا پہرہ تھا اور یہاں موجود لوگوں کی حیثیت محصورین کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ نزدیک دور کے دیہاتوں سے آنے والے لوگ بھی بھوگپور میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

گاؤں والوں نے "اکھنڈ صاحب" کا بھوگ ڈال دیا تھا اور نوجوان، بوڑھے سب مل کر ننگی کرپانیں ہاتھوں میں لئے گودوارے میں موجود تھے۔ کرمجیت کو آج پہلی دفعہ اپنی وردی سے نفرت کا احساس ہوا تھا۔

دوسرے دن حوالدار کرمجیت کی چھٹی ختم ہو گئی--!

اپنی کمپنی میں واپس لوٹتے ہوئے وہ دل میں بڑا بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ کمپنی میں پہنچنے پر یہ خبر بم کے دھماکے کی طرح اس کے ذہن میں پھٹی کہ اس کی کمپنی کے تین

سکھ فوجی اپنے اسلحے سمیت فرار ہو کر امرتسر پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے دربار صاحب میں سنت جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ کے پاس پناہ لے لی ہے۔ اس سے پہلے کہ کرمجیت کو خبر مل چکی تھی کہ سنت جرنیل سنگھ نے خود کو دربار صاحب میں محصور کر لیا ہے اور ان کے پیروکار اسلحہ لے کر ان کی حفاظت کر رہے ہیں۔ اسی اثناء میں پنجاب کے قریباً ہر دیہات میں سنت جی کے پیروکار سنت کا یہ پیغام پہنچا چکے تھے کہ تمام سکھ خود کو جدید ہتھیاروں سے مسلح کر لیں۔ کسی بھی لمحے انہیں زندگی موت کا معرکہ پیش آسکتا ہے۔

کرمجیت نے پروگرام کے مطابق اپنا ایک اور پیرا کمانڈو کورس کرنے ڈیرہ دون جانا تھا اور ذہنی طور پر خود کو اس کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اچانک اسے حکم ملا کہ اس کا کورس منسوخ ہو گیا ہے اب اس کورس میں صرف ہندو فوجی ہی شرکت کر سکیں گے۔ ملک کے مختلف حصوں سے سکھ فوجیوں کے فرار ہو کر زیرزمین سرگرم عمل خالصتان تحریک میں شامل ہونے کی اطلاعات نے فوج میں موجود باقی سکھوں کے خلاف شک کی فضا پیدا کر دی تھی اور یہ خبریں بھی ملنے لگی تھیں کہ بیشتر رجمنٹوں میں سکھوں سے بھاری اسلحہ بھی واپس لیا جا رہا ہے۔ ایک خاص حکمت عملی کے تحت سکھ فوجیوں کو چھاؤنیوں تک محدود کر دیا گیا۔

کورس سے اپنی علیحدگی کو کرمجیت نے بڑی شدت سے محسوس کیا وہ کمانڈو تھا اور اس کی فطرت میں مصروف پیکار رہنا داخل ہو چکا تھا لیکن یہاں اسے کوارٹر گارڈ کمانڈر بنا کر صرف چھاؤنی تک محدود کر دیا گیا تھا۔ اس دوران وہ اپنے گاؤں کے متعلق بڑی تشویش میں مبتلا رہا- وہ سمجھتا تھا کہ آرمی انٹیلی جنس سکھوں کے خطوط سنسر کرتی ہے اس لئے اس نے گاؤں میں کبھی خط نہ لکھا۔

وقت جیسے گزر ہی رہا تھا۔ جب یہ خبر بجلی بن کر کرمجیت پر گری کہ بھارتی فوج نے دربار صاحب پر حملہ کر دیا ہے- اندر موجود سنت بھنڈرانوالہ کے ساتھی جنرل شوبیگ

سنگھ کی کمان میں زندگی اور موت کا معرکہ لڑ رہے ہیں-- اس روز کرمجیت سنگھ کو شدت سے وہ مسلمان جنگی قیدی یاد آیا جس نے اس سے کہا تھا "ہماری اور ہندوؤں کی لڑائی تو ہزار سال سے جاری ہے تم دونوں کے بیچ کہاں سے آگئے۔"

"واقعی اس نے سچ کہا تھا--" کرمجیت بڑبڑایا۔

یہ خبر اس یونٹ میں دوپہر کے بعد پہنچی تھی۔ کرمجیت اپنی بیرک کے باہر کھڑا تھا۔ جب بیرک کے ایک کونے سے اس نے "ست سری اکال" اور "خالصتان زندہ باد" کے پرجوش جے کارے سنے۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی۔ پھر اس نے دیکھا پانچ غیر مسلح سکھوں کے ہاتھ ان کی پگڑیوں سے باندھ کر ہندو فوجی انہیں گنوں کے بٹ مارتے ہوئے اس طرف لا رہے تھے--!

"حوالدار صاحب! انہیں کوارٹر گارد میں بند کر دیں۔" ایک ہندو نائیک نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے سیلوٹ مارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے" مشکل اس کے منہ سے نکلا۔ وہ اس وقت کوئی بھی غلط قدم اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

جب وہ اپنی گن سنبھالتا ہوا سکھ فوجیوں کو اپنی نگرانی میں بند کروا رہا تھا تو ایک سکھ فوجی نے نفرت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

"تم کسی سکھ کے جنے ہی نہیں ہو بے غیرت، بے شرم ہرمندر صاحب تباہ ہو گیا اور تو ابھی تک ہندو کی نوکری کر رہا ہے۔ لعنت ہو تجھ پر۔" کرمجیت کا خون کھول اٹھا۔ لیکن مصلحت ہوش ہی میں تھی۔

وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔

پانچوں کو الگ الگ سیل میں بند کر کے انہوں نے چابیاں حوالدار کرمجیت کو لوٹا دیں اور اسے سیلوٹ مار کر واپس چلے گئے۔ کرمجیت بھی ان کے ساتھ ہی واپس لوٹ

آیا۔ کوارٹر گارد میں موجود جوان پہرے کے لئے وہاں موجود رہے۔ ابھی تک مشتعل سکھ فوجی اسے گالیاں دے رہے تھے۔

میدان صاف ہوتے ہی کرمجیت ان کے نزدیک آگیا-!

"سنو!" اس نے گالیاں بکتے سکھوں کو جوش غضب سے للکارا-" میں بھی جٹ کی اولاد ہوں۔ جاہلو! تمہاری طرح ایڑیاں رگڑ کر نہیں کچھ کر کے مروں گا۔ آؤ میرے ساتھ-!" اس نے موقع پر موجود سکھ لانس نائیک کو جس نے کوٹھریوں کی چابیاں پکڑی ہوئی تھیں اشارہ کیا اور چند منٹ کے بعد وہاں کرمجیت اور اس کے ساتھ لانس نائیک سمیت سات آدمی موجود تھے۔"

"ادھر آؤ- اس نے باقیوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"حوالدار کرمجیت کا رخ اسلحہ خانے کی طرف تھا-!

تھوڑی ہی دیر کے بعد ساتوں بپھرے ہوئے سکھ فوجی ایک ٹرک میں سوار جسے کرمجیت کا لانس نائیک مہندر سنگھ چلا رہا تھا میرٹھ چھاؤنی سے برآمد ہوئے۔ چھاؤنی کے دروازے پر جب انہیں مشتبہ سمجھ کر روکنے کی کوشش کی گئی تو حوالدار کرمجیت سنگھ کی سٹین گن کی سرخ زبان نے موقع پر موجود دونوں گارڈز کو چاٹ لیا۔

میرٹھ سے دہلی جانے والی سڑک پر پہنچنے سے پہلے ان کے فرار کی خبر ہر جگہ پہنچ گئی تھی اور ان کی سرکوبی کے لئے مناسب اقدامات کر لئے گئے تھے۔ چھاؤنی سے بمشکل دو کلومیٹر کے فاصلے پر ان کا پہلا ٹکراؤ اپنی ہی کمپنی سے ہوا۔ اس حملے میں جہاں کرمجیت سنگھ کے تین ساتھی مارے گئے وہاں دشمن فوج کو بھی خاصا جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ ایسی بغاوت گو کہ بھارت کی بیشتر چھاؤنیوں میں پھیل چکی تھی۔ لیکن میرٹھ شاید پہلی جگہ تھی جہاں "باغیوں" سے مقابلے میں ایک ہندو کرنل کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

تعاقب کرنے والے فوجیوں کو بتایا گیا تھا کہ مفرور ٹرک میں سوار حوالدار کرمجیت

سنگھ بڑا منجھا ہوا کمانڈو ہے اور اس کو زندہ یا مردہ بہر حال پنجاب میں داخل ہونے سے پہلے روکنا ہے۔

دوسری طرف میرٹھ سے ہی کرجیت نے باقی ساتھیوں سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اسی کے مشورے پر تمام لوگ اب الگ الگ سفر کر کے امرتسر کی طرف ان ہزاروں سکھوں کی طرح بڑھ رہے تھے جو یہاں محاصرے میں آئے اپنے سورماؤں کی مدد اور "پنتھ چڑھدی کلا" کے لئے اس طرف یلغار کر رہے تھے۔ شام ڈھلے تک اس نے خود کو کھیتوں میں چھپائے رکھا اور اندھیرا ہونے پر باہر نکل آیا۔ سویلین کپڑوں کا حصول اس جیسے ماہر کمانڈو کے لئے کوئی ایسا مشکل مسئلہ نہیں تھا۔ اسی کی تلاش میں بھارتی ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ باؤلے ہوئے جاتے تھے لیکن وہ ان کی دسترس سے باہر تھا۔

اگلے روز جب شام ڈھلے وہ امرتسر پہنچا تو شہر میں کرفیو نافذ تھا اور چپے چپے پر فوج پہرہ دے رہی تھی۔ شہر کو اس طرح فوج کے محاصرے میں لیا ہوا تھا کہ کسی پرندے کا پر مارنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ شہر سے باہر دیہاتوں میں مشتعل اور غم واندوہ کے مارے سکھ کرپانیں لہراتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔

یہیں اسے یہ جانگداز خبر بھی مل گئی کہ جنرل شوبیگ سنگھ اور سنت بھنڈرانوالہ مارے گئے ہیں۔ مزاحمت ختم ہو گئی ہے اور دربار صاحب کے اندر ہندو فوج نے خون کر ندیاں بہادیں ہیں۔ اندر موجود شاید ہی کوئی خوش قسمت زندہ بچ کر آیا ہو۔

امرتسر کے گرداگرد موجود قریباً ہر دیہات میں فوج کے ہاتھوں زخمی ہونے والے سکھ موجود تھے جنہیں لوگوں نے گھروں میں چھپایا ہوا تھا۔ رات گئے یہاں اطلاع پہنچ گئی کہ فوج نے بھگوڑے سکھ فوجیوں اور مشتبہ سکھوں کی تلاش میں امرتسر کے نزدیکی دیہاتوں پر دھاوا بول دیا ہے اور کسی بھی لمحے یہاں فوج پہنچ جائے گی۔

حوالدار کرجیت سنگھ نے اپنے ایک جاننے والے کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی اور

وہ نہیں چاہتا تھا کہ ان لوگوں پر اس کی وجہ سے کوئی مصیبت آئے گاؤں کے جذباتی سکھ نوجوانوں کو جب علم ہوا کہ وہ مفرور فوجی ہے تو اس کے پاس کرپانیں، پستول لے کر پہنچ گئے۔ وہ لوگ بضد تھے کہ کرجیت کی کمان میں نزدیکی تھانے پر حملہ کریں گے۔ کرجیت ایک تربیت یافتہ کمانڈو تھا اور اس طرح ان لوگوں کو اندھے کنوئیں میں چھلانگ لگانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے نوجوانوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن یہ لوگ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ اس طرح انہیں اکیلا مرنے کے لئے چھوڑ دینا اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد گاؤں کے پچاس سے زائد بپھرے ہوئے سکھ حوالدار کرجیت سنگھ کی رہبری میں تھانے کی طرف یلغار کر رہے تھے۔

تھانے پر اس نے حملہ اتنی تنظیم سے کروایا تھا کہ وہاں موجود پندرہ بیس اہل کاروں کو سنبھلنے کی مہلت ہی نہ مل سکی اور وہ قابو آ گئے۔ اسلحہ لوٹ لیا گیا اور حملہ آوروں نے پانچ سکھ اہل کاروں کو زندہ چھوڑ دیا۔ باقی دس ہندوؤں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جس جس سکھ نوجوان کے ہاتھ رائفل لگی وہ دوبارہ اپنے گاؤں کی طرف نہیں گیا۔ حوالدار کرجیت کے حساس کانوں نے گاؤں کی طرف جانے والی پکی سڑک پر سے آرمی کنوائے کی آوازیں سن لی تھیں۔ اس کا رخ کنوائے کی مخالف سمت ہو گیا۔ گاؤں پہنچنے پر فوج کو سب سے پہلے ٹاؤٹ نے اطلاع کر دی کہ نزدیکی تھانے کو لوٹنے اور ہندو پولیس اہل کاروں کے قاتل کا نام حوالدار کرجیت سنگھ ہے۔

تھوڑے عرصے کے بعد ہی کرجیت سنگھ کا شمار بھارت کے مستند "وہشت گردوں" میں ہونے لگا۔ بھارت سرکار نے اس کے سر کی قیمت پہلے پچیس پھر پچاس ہزار چھ ماہ بعد ایک لاکھ روپے مقرر کر دی۔

اس دوران کرجیت نے اپنے والد سے صرف دو مرتبہ ملاقات کی تھی۔ اس کی

حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ باپو کا رویہ پہلے سے یکسر بدلا ہوا ہے۔ اسے یہی امید تھی کہ باپو اس کی حرکت پر برہمی کا اظہار کرے گا لیکن اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ شاباش دیتے ہوئے کہا "بچہ! مجھے امید تھی میرا خون بے غیرت نہیں ہو سکتا۔"

دوسری مرتبہ جب کرجیت اپنے والد سے مل کر گیا اگلے ہی دن اسے اطلاع مل گئی کہ اس کے والد کو پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ اس درمیان اس کا رابطہ اپنے جیسے تین چار اور بھگوڑے فوجیوں سے ہو گیا تھا۔ یہ لوگ اب گروہ کی شکل میں کام کر رہے تھے۔

وہ روز بد بھی کرجیت نے دیکھ لیا جب اسے اطلاع ملی کہ اس کا بوڑھا باپ "پولیس مقابلے" میں مارا گیا ہے۔ اس روز پھر حوالدار کرجیت سنگھ کو بڑی شدت سے وہ مسلمان فوجی یاد آ گیا۔ اسے اب "بھارت ماتا" سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ "بھارت ماتا" جس کے لئے اپنی جان دینا اس کی زندگی کا سب سے بڑا "آدرش" تھا اسے سیکولرازم کی خود ساختہ اصطلاح سے جتنی نفرت آج محسوس ہو رہی تھی اتنی شاید پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ ہندو جو بظاہر بھیڑ کی کھال اوڑھے ہوئے ہے اس سے زیادہ خونخوار بھیڑیا شاید روئے زمین پر اور کہیں نہیں پایا جاتا۔

"سمندر سنگھ"-- اس نے غم و غصے کی شدت سے کھولتے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ "مجھے قسم ہے واہگورو کی! اگر کل رات تک تھانیدار ورما کو گاڑی نہ چڑھا دوں تو کسی سکھ کا جنا نہیں--"

"ہم تیرے زندگی موت کے ساتھی ہیں حوالدار--" لانس نائیک سمندر سنگھ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

واقعی اس نے جو کہا کر دکھایا۔ اگلے روز علی الصبح کرجیت اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ تھانیدار ورما کو گاؤں کے باہر لاری اڈے پر گھیرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ورما کسی

گشت سے واپس آ رہا تھا جب وہ اور اس کے دونوں سپاہی کرجیت کی گولیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ کرجیت تو آندھی کا جھونکا تھا جانے کدھر سے آیا اور کدھر نکل گیا۔ سیکورٹی والے اس کے متعلق سوچ کر پریشان ہو جاتے تھے۔ ان کا واسطہ اپنی ہی فوج کے کمانڈو سے پڑ گیا تھا۔

ایس پی کھوسلہ نے چارج لیتے ہی سب سے پہلے کرجیت کی فائل طلب کی اور رات دیر گئے تک اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نتیجے پر پہنچ کر خود ہی مسکرا دیا۔ اس نے کرجیت کی غیرت پر ہاتھ ڈال کر اسے بلیک میل کر کے گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ صبح دیر گئے تک وہ سوتا رہا۔ اگلے روز اس نے ایک خصوصی میٹنگ علاقے کے پولیس افسران کی طلب کی تھی۔ ایک ٹیم کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ کوئی بھی راز فاش ہو جانے کے پیش نظر کھوسلہ نے یہ خصوصی احتیاط برتی تھی کہ اس ٹیم میں کوئی سکھ اہل کار شامل نہ کیا جائے۔

اس روز رات کے دو بجے بھوگپور کے لوگ پھر ایک نئی قیامت کا سامنا کر رہے تھے۔ حاکم سنگھ کے مکان کو سیکورٹی حکام نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ وہ لوگ حاکم سنگھ کی بیٹی ستوندر کو گرفتار کرنے آئے تھے۔ پولیس کو شک تھا کہ ستوندر بھگوڑے دہشت گرد کمانڈو کرجیت کی ساتھی ہے اور اس کے خفیہ ٹھکانوں کا علم رکھتی ہے!

حاکم سنگھ نے صورت حال کی نزاکت جانتے ہوئے برچھا خود تھام لیا تھا اور کرپان اپنی بیٹی کو تھما دی تھی۔

"میری بچی! رب راکھا! جیتے جی ان موزیوں کے ہاتھ نہ آنا۔ اگر بچ کر نکل سکو تو نکل جاؤ اب تیری زندگی کرجیت کے لئے ہے۔ تو اس کی عزت ہے۔ جٹ کی بچی بننا میری بچی! میرے مرنے کے بعد دنیا کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ حاکم سنگھ کی بیٹی کو ہندو کے غلیظ ہاتھوں نے چھو لیا تھا۔ واہگورو جی کا خالصہ۔ واہگورو جی کی فتح۔" حاکم سنگھ تیزی

سے باہر نکل گیا۔

"باپو! میری رگوں میں بھی اگر تیرا ہی خون ہے تو دنیا جان لے گی کہ خالصہ ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دیتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی اس نے بھی "فتح" بلائی اور باپ کے تعاقب میں باہر لپکی۔

دونوں کے تیور دیکھ کر کھوسلہ نے جو خود اس مہم کی کمان کر رہا تھا اندازہ لگا لیا کہ یہ زندہ ہاتھ آنے والے نہیں۔ ان کی طرف بڑھنے والے دونوں پولیس کے جوان چند منٹ میں ہی برچھے اور کرپان کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اور۔ تھوڑی دیر بعد بھوگپور کے لوگ پھر وہی تماشہ دیکھ رہے تھے جو اس گاؤں کا شاید نصیب بن چکا تھا۔ باپ بیٹی خون میں لت پت گھر کی دہلیز کے سامنے گرے پڑے تھے اور پولیس ان کی لاشیں گھسیٹ کر ساتھ لے جا رہی تھی۔ اس منظر نے کھڑکیوں اور دروازوں کی اوٹ سے جھانکتی آنکھوں کو خون رلا دیا۔ کسی سمت سے "جیکارا" گونجا اور گاؤں کے لوگوں نے پولیس پارٹی کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے پولیس کو مجبور کر دیا کہ لاشیں گاؤں سے باہر نہیں جانے دیں گے۔ کھوسلہ نے ایک دنیا دیکھی تھی۔ وہ ٹھنڈے دماغ کا افسر تھا۔ بپھرے ہوئے ہجوم سے اپنی بوٹیاں نچوانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

پولیس لاشیں چھوڑ کر چلی گئی۔!

آخری رسومات میں کرجیت نے شرکت کی اور پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا۔

بیاس سے راتوں رات سفر کر کے وہ گورداسپور کے ایک سرحدی گاؤں میں اپنے ایک ساتھی کے ٹھکانے پر آ گیا تھا۔ تین چار دن یہاں چھپا رہا اور ایک روز مقامی ٹاؤٹ کی نظروں میں آ گیا۔

اس رات جب وہ یہاں سے نکلنے کی تیاریاں کر رہا تھا تو انڈین فوج کی کی پوری کمپنی نے گاؤں کو گھیر لیا۔ اس دفعہ مقابلہ اپنے ہی جیسے لوگوں سے تھا۔ کرجیت نے جی کے ارمان خوب خوب نکالے لیکن قسمت نے وفا نہ کی اور اسلحہ دغا دے گیا۔ خالی ہاتھ وہ سرحد کی طرف بھاگا اور بمشکل چند گز بھاگنے پر ہی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

اگلے روز بھارتی ذرائع ابلاغ نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ خبروں کے مطابق "مشہور دہشت گرد کرجیت سنگھ سابقہ حوالدار پاکستان سے اسلحہ لے کر بھارت کی سرحد میں داخل ہو رہا تھا کہ سرحدی محافظوں کے ساتھ مقابلے میں مارا گیا۔"

اس کے ساتھ ہی بھارتی حکومت نے پاکستان سے زبردست احتجاج کیا تھا کہ وہ سکھوں کے تربیتی مراکز بند کر دے۔

سلطانی گواہ

مجھے حال ہی میں عدالت نے میری حالت پر رحم کھاتے ہوئے دس سال قید بامشقت کی سزا دی ہے۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جج کے دل میں خدا نے میرے لئے رحم کے جذبات پیدا کر دیئے۔ ورنہ مجھے بھی اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح ساری عمر جیل میں سڑنے کے لئے پھینک دیا جاتا۔ آج میں سوچ رہا ہوں۔ جن کے لئے میں نے یہ سب کچھ کیا۔ انہیں میرا نام بھی یاد رہا ہے یا نہیں؟ میرے خیال سے انہوں نے میرا نام بھی بھلا دیا ہوگا۔ یوں بھی اب میری حیثیت چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

گزشتہ آٹھ ماہ تک میرا مقدمہ ملک کی مختلف عدالتوں میں چلتا رہا۔ لیکن میں نے کوئی شناسا چہرہ نہیں دیکھا۔ میری مدد کو کوئی نہیں آیا۔ سوائے میرے بیگناہ بوڑھے والدین کے یا پھر میری بیوہ بہن جو دن رات بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر میرے مقدمات کا خرچ چلاتی رہی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ عالیہ مجھے اتنی جلدی بھول جائے گی۔ جس کے لئے میں نے زندگی کی سیدھی سادی شاہراہ کو چھوڑ کر پر خار اور تھکا دینے والے راستوں کا انتخاب کیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تو

میرے والد نے جو ہمارے گاؤں کے پرائمری سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ مجھے کہا تھا۔

"بیٹا: تمہارے نمبر اتنے کم اور کرتوت اتنے بڑے ہیں کہ اپنی حلال کمائی سے تمہیں مزید تعلیم دلانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرا جی چاہتا کہ تمہاری دو جوان بہنوں کو چھوڑ کر اب بھی تمہارے چاؤ چونچلے پورے کرتا رہوں۔ لیکن کیا کروں؟ میں مجبور ہوں۔ خدا نے مجھے ایک ہی بیٹا دیا ہے اور اس کی تربیت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈال دی ہے۔ اگر کوتاہی کرتا ہوں تو دنیا کہے گی۔ حاکم دین نے بیٹوں کی خاطر واحد اولاد نرینہ کو چھوڑ دیا۔ کاش خدا نے مجھے تمہاری جگہ بھی بیٹی ہی دے دی ہوتی کم از کم مجھے اس طرح سسک سسک کر تو زندگی کے دن پورے نہ کرنے پڑتے۔"

میں نے اپنے والد کی تقریر اس کان سے سنی اور اس کان سے نکال دی۔ اب میں ایسی تقریروں کا عادی ہو چکا تھا۔ باپ مجھے ڈانتا تو ماں میرا ساتھ دیتی میرے لاشعور میں بھی یہ بات سما چکی تھی کہ میں والدین کی واحد اولاد نرینہ ہوں۔ شاید ان کی اسی کمزوری کو میرے اندر بیٹھا شیطان ایکسپلائٹ کر رہا تھا۔

پانچویں تک تو میں اپنے والد کے سکول میں پڑھتا رہا۔ ہائی سکول ہمارے گاؤں سے پانچ چھ میل دور تھا اور جس علاقے کے ہم رہنے والے ہیں۔ وہاں یہ پانچ چھ ہزار میل کے برابر ہوتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں بجلی آئے تین چار سال ہوئے تھے۔ کیونکہ ہمارا گاؤں سڑک کے نزدیک تھا۔ یہاں کے بیشتر دیہاتوں میں تو بجلی بھی نہیں تھی۔ والد صاحب نے اپنا واحد اثاثہ جو سائیکل کی شکل میں محفوظ رکھا تھا مجھے منتقل کر دیا۔ میں سائیکل پر ہی سکول آنے جانے لگا۔ اس گاؤں کا میں واحد لڑکا تھا جو ہائی سکول جا رہا تھا۔ یہاں تو لوگ بچوں کو پرائمری تعلیم دلانا بھی مصیبت سمجھتے تھے۔ میرے والد صاحب کی لاکھ کوشش پر بھی پرائمری سکول میں کبھی ساٹھ ستر سے زیادہ بچوں کی تعداد نہیں ہو سکی تھی۔

ہائی سکول میں آٹھویں جماعت تک تو والد کی خصوصی توجہ اور سختی میں پڑھائی کی طرف راغب رہا۔ آٹھویں کے بعد میں بھی دوسرے لڑکوں کی دیکھا دیکھی خلیفہ بن گیا۔ گھر سے سکول جاتا اور راستے میں گلی ڈنڈے کا میچ کھیلنے لگتا۔ دسویں جماعت تک مجھے نوجوانوں والی تمام بری عادتیں پڑ چکی تھیں۔ میرے والد دو تین ماہ بعد جب کبھی سکول جاتے اور میرے متعلق انہیں صحیح رپورٹ ملتی تو مجھے پہلے ایک آدھ تھپڑ لگا دیتے پھر ڈانٹتے اور آخر میں نصیحتوں کے انبار کے ساتھ سلسلہ کلام ختم ہو جاتا۔

میری نوجوان بہنیں تھیں۔ جنہوں نے مقامی روایات کے مطابق قرآن پاک کی تعلیم حاصل کی تھی یا پھر ماں سے سینے پرونے کا کام سیکھ لیا تھا۔ لیکن میری بڑی بہن کو والد صاحب نے اس کا رجحان دیکھتے ہوئے خصوصی توجہ سے میٹرک کا امتحان پاس کروانے کے بعد سی ٹی کا کورس بھی پاس کروادیا تھا۔ جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو وہ نزدیک کے ایک گاؤں میں قائم لڑکیوں کے پرائمری سکول میں استانی لگ چکی تھی۔ چھوٹی بہن بھر پر بچوں کو قرآن پڑھاتی تھی۔ بس ایک میں تھا جو والدین کی توقعات پر کبھی پورا نہ اترا۔

میٹرک پاس کرنے تک مقامی نوعیت کے بیشتر جرائم میں سر انجام دے چکا تھا۔ اب دل میں ایک ہی خواہش تھی کہ جلد از جلد جس طرح بھی ہو میں لاہور کے کسی کالج میں داخل ہو جاؤں اور وہاں خوب موج میلہ کروں۔

میں نے لاہور زندگی میں دو مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک دفعہ جب ہم سب گھر والے داتا صاحب کے مزار پر سلام کرنے آئے تھے۔ دوسری مرتبہ جب میری ماں کے ایک دور پار کے رشتے داروں کے ہاں اپنی بہن کا رشتہ دیکھنے آئے بعد میں اس گھر میں میری بہن کی شادی بھی ہو گئی تھی۔

میں نے میٹرک کا امتحان سکینڈ ڈویژن میں بھی جس طرح پاس کیا وہ کچھ میں ہی

جانتا تھا۔ اگر والد صاحب کو علم ہو جاتا تو وہ کبھی ایک پھوٹی کوڑی بھی مجھ پر خرچ نہ کرتے۔ میں نے امتحانی سنٹر کے سپرنٹنڈنٹ سے دو روز پہلے ہی اپنے ساتھیوں کے ساتھ ملاقات کر کے اسے کہہ دیا تھا کہ ہم اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ وہ ہمارے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑائے۔

سپرنٹنڈنٹ کھانے پینے والا آدمی تھا۔ اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لینے کا وعدہ کر لیا اور میں نے جیسے تیسے میٹرک کا امتحان بھی پاس کر لیا۔ اس درمیان میری بڑی بہن بیاہ کر اپنے سسرال لاہور جا چکی تھی۔ لاہور ہمارے گاؤں کے نزدیک نہیں تھا۔ راستے میں کئی اور کالج بھی آتے تھے۔ والد صاحب مجھے یہاں داخلہ دلانے پر تیار نہیں تھے لیکن ماں بضد کے سامنے اُنہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ہماری تھوڑی بہت زمین تھی۔ جس سے گھر کا خرچ چل جاتا تھا۔ دیہاتوں میں زندگی کے شہر ایسے مسائل بھی نہیں ہوتے۔ والد صاحب کی تنخواہ کافی عرصے سے بینک میں ہی جمع ہو رہی تھی۔ وہ شاید بیٹیوں کی فکر کرتے تھے اور ان کے لئے ہی پیسے جمع کروا رہے تھے۔

جب والد صاحب مجھے لاہور کے ایک کالج میں جیسے تیسے داخل کروا کر گئے انہوں نے مجھے کہا!

"جاوید بیٹا! میں اتنی حیثیت کا مالک نہیں لیکن تمہاری ماں کی ضد کے سامنے مجھے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ خدا کرے میرے خدشات غلط ثابت ہوں اور تمہیں عقل آجائے۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تم سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ تمہارے ماضی کے ایک ایک پل کی خبر مجھے ہے لیکن میں تمہاری ماں کو کچھ بتا کر اسے دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے بد قسمتی سے تم سے بہت سی امیدیں وابستہ کر لی ہیں۔ خدا کرے تم اس کی امیدوں پر پورے اترو۔ بیٹا! لاہور بڑا شہر ہے۔ میں سینکڑوں میل دور

سے یہاں آکر تمہاری خبر گیری نہیں کر سکتا۔ اس بات کا احساس کرنا کہ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر قدم اٹھایا ہے۔

میرے لئے والد کی نصیحتیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بس یہی دل چاہتا تھا کہ جلد از جلد وہ یہاں سے چلے جائیں۔ دیہاتی ہونے کے ناطے میرے لئے لاہور جیسا بڑا شہر بظاہر تو اجنبی اور چونکا دینے والا ہونا چاہئے لیکن یہاں رہ جانے اور اپنے خوابوں کو پورا کرنے کی ایسی خوشی اور دھن دل میں سمائی تھی کہ میں خود کو یہاں اجنبی محسوس نہیں کرتا تھا۔

مجھے جس کالج میں داخلہ ملا وہ ہنگامہ آرائی کے لئے خاص شہرت رکھتا تھا۔ کالج کے ہوسٹل میں جو کمرہ مجھے الاٹ ہوا۔ اس میں پہلے ہی سے عارف مقیم تھا عارف بگڑا ہوا امیر زادہ تھا۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا۔ لیکن آٹھ دس ماہ تک ہم ایک دوسرے سے فری نہ ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ تو تین ماہ کی چھٹیاں تھیں۔ اس کے بعد مستقل ہنگاموں کی وجہ سے کالج مزید تین ماہ بند رہا۔ کالج کھلنے پر دس پندرہ روز ہم تو ایک دوسرے سے کھچے کھچے رہے۔ پھر آپس میں کھل گئے اس نے مجھے کرید کرید کر میرے ماضی کے متعلق کافی کچھ جان لیا تھا اور شاید یہ اندازہ بھی اس کو بخوبی ہو گیا تھا کہ میں اس کے کام کا آدمی ہوں۔

ایک روز اس نے کھل کر کہہ ہی دیا۔ "جیدے یار تم بندے تو کام کے نظر آتے ہو لیکن ہو ذرا بزدل۔"

"ملک صاحب! آئندہ مجھے مذاق میں بھی کبھی یہ بات نہ کہنا۔ جب جی چاہے میری مردانگی کو آزما لینا۔" میں نے بڑے پرجوش لہجے میں کہا۔ "اچھا! اچھا وقت آیا تو دیکھ لیں گے۔"

یہ وقت اگلے ہی روز آگیا---!

چھٹی کا دن تھا۔ ہوسٹل میں خاصی بے رونقی تھی۔ اس روز ایک کار میں کچھ لوگ بیٹھ کر آئے انہوں نے خود کو ملک عارف کا رشتے دار بتایا اور اسی کے کمرے میں آگئے۔ لیکن میں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ اس کے رشتہ دار نہیں بلکہ اسی کی قماش کے دوست ہیں۔ عارف نے مجھے سو روپیہ کا نوٹ تھماتے ہوئے نزدیکی کنٹین سے کچھ لانے کو کہا۔ میں نے فوراً سو کا نوٹ پکڑ لیا۔ وہ اسی طرح پہلے بھی مختلف بہانوں سے اپنی امارت کا رعب مجھ پر ڈال چکا تھا۔

جب میں کھانے پینے کی اشیائے کے لفافے لے کر وہاں پہنچا تو کمرے کو اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میری آواز پہچاننے پر عارف نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی میری نگاہوں نے جو منظر دیکھا وہ بڑا مکروہ اور ناقابل بیان ہے۔ میرے اندر آنے پر بھی اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس کے باقی ساتھیوں نے چرس سے بھرے سگریٹ سلگائے ہوئے تھے اور لمبے لمبے کش لے رہے تھے۔

"کیوں بھئی جیدے کیا پروگرام ہے۔" ملک عارف نے اپنے مکروہ کام سے فارغ ہو کر مجھے مخاطب کیا۔

ایک مرتبہ تو میں سہم کر رہ گیا۔ لیکن حوصلہ کر کے میں نے کہہ دیا۔ "نہیں ملک جی! پھر کبھی سہی۔"

"جیسی تمہاری مرضی بھئی۔" ملک نے قہقہہ لگایا۔

اس قہقہے میں وہ نامرد اور اس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ شامل تھے۔ میں نے ملک عارف کے اشارے پر میز پر کھانے پینے کی اشیاء رکھ دیں۔ باقی تیس چالیس روپے اسے واپس کرنے چاہے۔ تو اس نے زبردستی میری قمیض کی جیب میں ڈال دیئے اور ہنس کر بولا۔

"یار جیدے! ہم یاروں کے یار ہیں۔ کسی شے کی فکر نہ کرنا۔"

"ملک جی! آپ کے ہوتے ہوئے مجھے فکر کس بات کی۔" میں نے ندیدے بچوں کی طرح دانت نکالے اور اسی کے باقی چمچوں کے ساتھ مل کر کھانے پینے کی اشیاء پر ٹوٹ پڑا۔

کھانے سے فارغ ہو کر انہوں نے نزدیکی کنٹین سے چائے منگوائی۔ میں اس کے ملازموں کی طرح عارف کے ہر حکم کی تعمیل کر رہا تھا۔ جب میں چائے لے کر واپس آیا تو ایک اور لڑکا اسی لڑکے کے ساتھ ملک عارف والے قبیح فعل میں مصروف تھا۔

دونوں فارغ ہونے کے بعد ایک دوسرے بے ہودہ مذاق کرتے رہے۔ میں نے اندازہ لگالیا کہ یہ لوگ اس گندے فعل کے عادی ہیں۔ چائے پینے کے بعد انہوں نے وہاں جوا کھیلنا شروع کر دیا اور شام ڈھلے تک جوا کھیلنے میں مصروف رہے۔ اس دوران میں نے ایک خاص بات نوٹ کی کہ یہاں جتنا بھی جوا ہوا اس میں ایک خاص حصہ ملک عارف کا ہوتا تھا۔ جتنی رقم بھی کوئی جیتا اس کا کچھ حصہ ملک عارف کی جیب میں چلا جاتا۔ اسے یہ لوگ اپنی زفان میں "نعل" کہتے تھے۔

شام ڈھلنے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگے تو ملک عارف نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کر کے پھر میری منشا دریافت کی۔ لیکن ابھی شاید میں جھجک رہا تھا۔ یا پھر کوئی لاشعوری خوف دامن گیر تھا کہ میں نے پھر انکار کر دیا۔ لیکن انکار کرتے ہوئے بڑی گول مول سی زبان استعمال کی۔ ملک عارف نے یہی سوچا ہوگا کہ میں شاید زیادہ لوگوں کی موجودگی میں جھجک محسوس کرتا ہوں۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔

"یہ کیا ملک جی!" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"تمہارا حصہ۔" ملک عارف نے بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جیدے! ہم یاروں کے یار ہیں۔ جس کام میں ہمارا ساتھ دوگے اس میں حصہ

ضرور ملے گا۔ لینا نہ لینا تمہاری مرضی۔"

"ہم تو آپ کے خادم ہیں ملک جی۔" خدا جانے ایسا گھٹیا اور کمینگی کا انداز لئے ہوئے زبان میں کیسے اس کے سامنے بولتا رہا میری حالت تو اپنے گاؤں میں ان میراثیوں سے بھی بدتر تھی۔ جو چوہدریوں کے سامنے ہاتھ باندھ کھڑے رہتے ہیں واقعی ملک عارف نے مجھے اپنا "کاما" بنالیا تھا

مجھے لاہور میں پڑھتے دو سال ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران دو مرتبہ میرے بہنوئی مجھے کالج میں ملنے آئے اور زبردستی اپنے گھر لے گئے۔ جہاں میری بہن مجھے ایک ہی بات سمجھاتی کہ میں اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور ان کے مستقبل کی واحد امید ہوں اور مجھے کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جو ان کے لئے باعث دکھ ہو۔ میں حسب روایت "ہوں ہاں" کر کے واپس لوٹ آتا۔ والد صاحب کا خط باقاعدگی سے آتا اور میں بھی انہیں جواب لکھ کر مطمئن کر دیتا۔

اس واقعے کے اگلے ہی روز ملک عارف مجھے لاہور کے اس بازار میں لے گیا۔ ہم جس کوٹھے پر گئے۔ وہ لوگ اسے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اس کی آمد پر انہوں نے اتنی خوشی کا اظہار کیا۔ جیسے ان کے اجڑے ہوئے چمن میں بہار آگئی ہو۔ وہ لوگ ملک عارف کے ساتھ ساتھ میرے بھی صدقے واری جا رہے تھے۔ میں تھا تو گیارہویں جماعت کا طالب علم لیکن میرا قد کاٹھ اور جسمانی ساخت دیکھ کر اکثر لوگ دھوکہ کھا جاتے تھے۔ یہاں عارف نے میری ملاقات ایک نوجوان لڑکی سے کروائی اس کی عمر تو مجھ سے زیادہ تھی۔ لیکن پہلی ہی نظر میں اسے میں دل دے بیٹھا۔ اس لڑکی کا نام عالیہ تھا۔

ہم رات دیر گئے ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوسٹل واپس آگئے۔

عالیہ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا اور میں اس کی خاطر اب کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ پانچ چھ روز اس کی جدائی میں جسطرح میں نے کاٹے وہ کچھ

میں ہی جان سکتا ہوں۔ اس دوران ہمارے کمرے میں قریباً روزانہ جوا اور دوسرے غلط کام کیے جاتے۔ عارف مجھے باقاعدگی سے میرا حصہ دیتا رہا۔ ایک مرتبہ اس کے کہنے پر اس کی موٹر سائیکل پر میں اس کے لئے ایک خفیہ اڈے سے شراب کی بوتل بھی لے کر آیا۔ میں سگریٹ تو سکول کے زمانے سے ہی پینے لگا تھا لیکن ابھی کوئی اور نشہ نہیں کیا تھا۔ ایک روز عارف نے مجھے بھی زبردستی ایک پیگ لگوا دیا۔ میرے لئے تو یہی کافی تھا۔ خدا جانے میں شراب پی کر کیا اول فول بکتا رہا۔

صبح دیر گئے تک میں سوتا رہا۔ آنکھ کھلی تو سورج سر پر آ گیا تھا۔ عارف اور اس کا ایک دوست چرس سے بھرے سگریٹ پی رہے تھے۔ میرا سر ابھی گھوم رہا تھا میں اٹھ کر نہانے چلا گیا۔ نہا کر واپس آیا تو قدرے نارمل ہوا۔

عارف نے وہاں موجود نوجوان کا تعارف طاہر کے نام سے کروایا۔ میں نے اس کا نام تو سن رکھا تھا۔ یہ ہمارے کالج کی یونین کا صدر تھا۔ عارف نے میرے لئے ناشتہ وہیں منگوا لیا اور طاہر کے سامنے میری تعریفوں کے پل بھی باندھ دیئے۔ اس نے بتایا کہ کالج کے الیکشن نزدیک آ گئے ہیں اور مخالف تنظیم کی طرف سے غنڈہ گردی کا خطرہ ہے۔ عارف نے بتایا کہ ہوسٹل میں وہ جوا خانہ اور دیگر بدمعاشیاں یونین کے صدر کی مدد سے ہی چلا رہا ہے اور آج وقت آ گیا ہے کہ وہ بھی طاہر کے کام آئے کیونکہ اسی کی وجہ سے آج تک کسی نے ان کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھا۔

"ہمیں کرنا کیا ہے ملک جی!" میں نے مرے کی طرح گردن پھلا کر پوچھا۔

"یار جیدے بس ذرا دو چار فائر کرنے ہیں۔ یہ شہری بابو ہیں ان کے لئے اتنا ہی کافی ہوگا۔" عارف نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

"بے فکر ہو جاؤ جناب کوئی آپ کی طرف ہمارے ہوتے ہوئے میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔" میں نے پیشہ ور بدمعاشوں کی طرح اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

وہاں ہائی سکول میں میں نے ڈانگ سوٹا اور چاقو وغیرہ تو چلایا تھا۔ لیکن پستول کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں طاہر نے مجھے ایک ریوالور اور چند گولیاں دے دیں۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں کالج کی حدود میں جو جی چاہے کر سکتا ہوں یہاں کسی کی جرأت نہیں کہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات بھی کرے۔

پستول اور گولیاں ہم نے سنبھال لیں۔ طاہر چلا گیا۔ اس روز دوسری مرتبہ ملک عارف مجھے پھر بازار حسن لے گیا۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں عالیہ کو دل دے بیٹھا ہوں۔

"جیدے یار یہ کنجر لوگ نمود و نمائش کے بھوکے ہوتے ہیں۔ اگر اس کا دل جیتنا چاہتے ہو تو مال خرچ کرو۔ اسے سونے کی زنجیروں سے اس طرح جکڑ دو کہ پھر وہ تمہارے جال سے کبھی نکل نہ سکے۔" ملک عارف نے مجھے سمجھایا۔

"لیکن اتنا مال آئے گا کہاں سے؟" میں نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"یار تم اس معاملے کی فکر نہ کرو۔ یہ مسئلہ مجھ پر چھوڑ دو ہم یاروں کے یار ہیں آخر کس روز تمہارے کام آئیں گے۔"

میرے پاس عارف کے دیئے ہو جو پانچ چار سو روپے جمع تھے ان کی میں نے اس کے کہنے پر ایک بیش قیمت ساڑھی خریدی اور ہم عالیہ کے ڈیرے کی طرف چل دیئے۔ میں نے عارف کے کہنے کے مطابق اسے ساڑھی پیش کی تو عالیہ کھل اٹھی اور شکریہ ادا کر کے ساڑھی وصول کر لی۔

"کسی روز انہیں رات کو لائیے ناں ملک جی!" عالیہ نے میری طرف اشارہ کر کے عارف سے کہا۔

"اتنی بے صبری اچھی نہیں عالیہ بیگم لے آئیں گے کسی روز" ملک نے کہا اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

میں ہونقوں کی طرح ان کا منہ دیکھتا رہا۔ یہ جانے بغیر کہ وقت میری ہنسی اڑا رہا ہے۔

واپسی پر مجھے عارف ملک ذہنی طور پر تیار کرتا آیا کہ ہمیں پیسے حاصل کرنے کے لئے کوئی بڑا کام کرنا چاہئے۔ لیکن ابھی تک اس نے مجھے کام کی نوعیت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

تین چار روز بعد طاہر کی پستول استعمال کرنے کا موقعہ بھی آ ہی گیا۔ آج کالج کے میدان میں مخالف طلبا تنظیم کا جلسہ تھا۔ ہم نے جلسے کو ناکام بنانا تھا۔ ہمارے علاوہ وہاں طاہر والی طلبا تنظیم کے اور لوگ بھی اس "کار خیر" میں حصہ ڈالنے کو موجود تھے۔ وہ تھے تو بظاہر اسی طلباء تنظیم کے ممبر لیکن ان کا اس کالج سے کیا کسی بھی کالج سے دور دور کا علاقہ نہیں تھا اور تمام شکل سے چھٹے ہوئے غنڈے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے ہی دوسری تنظیم کی طرف سے صدارتی امیدوار نے اپنی تقریر کا آغاز کیا۔ میدان کے ایک کونے سے کسی نے ہوا میں گولی چلا دی۔ وہ لوگ بھی شاید تیار ہو کر آئے تھے۔ ان کے سٹیج پر موجود ساتھیوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ اب ہمارا کام شروع ہو گیا تھا میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ کپکپاتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب سے بھرا ہوا ریوالور نکالا اور سٹیج کی سمت دو تین فائر کر دیئے۔ میں سٹیج کے قدرے قریب کھڑا تھا اور اس طرف کوئی متوجہ بھی نہیں تھا۔ خدا جانے سٹیج سیکرٹری کو کس کی گولی لگی۔ لیکن میں یہی سمجھا کہ اسے میری چلائی ہوئی گولی ہی لگی ہے۔ سٹیج پر چیخ بلند ہوئی اور مجمع میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا وہ بھاگنے لگا۔ میں نے مزید نمبر بنانے کے لئے دھڑ دھڑ گولیاں چلانی شروع کر دیں اور چند منٹوں میں تمام گولیاں ختم کر دیں۔

اچانک ہی کسی نے میرا بازو پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔ میں نے دیکھا یہ ملک عارف تھا......

"چلو، چلو! بھاگ چلیں۔ اسے تمہاری گولی لگی ہے۔" اس نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ میں گدھوں کی طرح اس کے ساتھ بھاگنے لگا۔

کالج کی پچھلی دیوار پھلاند کر ہم باہر نکلے جہاں ملک عارف کا ایک ساتھی اس کی موٹر سائیکل سمیت موجود تھا۔ اس نے ہماری شکل پر نظر پڑتے ہی موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور ایک طرف ہٹ گیا۔ عارف نے گدی سنبھال لی میں اس کے پیچھے بیٹھا اور موٹر سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ملک عارف موٹر سائیکل چلاتے ہوئے مجھے مسلسل داد دیتا رہا۔ میں نے بڑی جوانمردی دکھائی ہے۔ خدا جانے اس لڑکے کو گوئی کس نے ماری تھی۔ کم از کم میرا یہ ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ لیکن ملک عارف نے میری جس انداز سے تعریف شروع کی تھی۔ اس سے مجھے یوں لگا جیسے واقعی یہ کارنامہ میں نے انجام دیا ہو۔

ہمارے سفر کا اختتام ایک ماڈرن آبادی کی شاندار کوٹھی پر ہوا۔ جس کے باہر ایک مسلح گارڈ کھڑا تھا۔ عارف کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ موٹر سائیکل وہ سیدھے کوٹھی کے لان تک لے آیا۔ شاید موٹر سائیکل کی آواز سن کر ہی ایک ڈھلتی عمر کا گنجے سر والا موٹا سا آدمی باہر آیا۔ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا کہ اس شخص کو میں نے پہلے بھی ضرور کہیں دیکھا ہو گا۔

"ویل ڈن ملک! ویل ڈن!" اس نے موٹر سائیکل رکتے ہی تالی بجاتے ہوئے کہا ہم دونوں کوٹھی کے برآمد میں پہنچ چکے تھے۔ اس نے گرمجوشی سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا۔

"بیگ صاحب یہ ہے اپنا یار جاوید خاں جس نے آج کا کارنامہ انجام دیا ہے۔" اور جیدے یہ بیگ صاحب ہیں تم جانتے ہی ہو گے۔ ان کے تعارف کی تو کوئی ضرورت میرے خیال سے نہیں ہے۔" ملک عارف نے مجھے مخاطب کیا۔

"شاباش جوان۔ واقعی ہمیں تم جیسے بہادروں کی ضرورت ہے۔ ملک عارف یار تم نے آج تک یہ ہیرا کہاں چھپا کر رکھا تھا۔" اس نے میرے بازوؤں کی مچھلیوں کو ٹٹولتے

ہوئے ملک عارف کی طرف دیکھ کر قہقہہ لگایا۔

"بیگ صاحب ہم وقت آنے پر ہی مال باہر نکالتے ہیں۔" ملک عارف نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"واہ بھئی واہ۔ کمال کر دیا تم نے۔ پرواہ نہیں وہ سالا مر بھی جائے تو پرواہ نہیں کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔" بیگ صاحب نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔

وہ ہمیں اپنے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ اس ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر ایک دفعہ تو میں بھونچکا ہی رہ گیا۔ میں نے ایسے کمرے فلموں میں تو دیکھے تھے۔ عملی زندگی میں آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ بیگ صاحب نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا اور چند منٹ بعد ہی ہمارے سامنے پر تکلف چائے دیگر لوازمات سمیت موجود تھی۔ اس دوران ملک عارف میری جھوٹی سچی تعریف کرتا رہا۔ اس نے بیٹھے بیٹھے جانے کتنے کارنامے میری ذات سے منسوب کر دیئے اور میں گدھوں کی طرح سر ہلاتا رہا۔ مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ میں اپنی معصومیت کے ہاتھوں کس طرح آہستہ آہستہ اپنی قبر کھود رہا ہوں۔ میں قدم بقدم گہری دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا اور اپنے انجام سے بے خبر بڑی خوشی سے قربانی کا بکرا بنا ہوا تھا۔

اس اثنا میں بیگ صاحب کے سامنے رکھے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور انہیں مطلع کیا گیا کہ جس لڑکے کو گولی لگی ہے اس کی حالت نازک ہے۔ مخالف فریق نے ہماری یونین پر پرچہ کروا دیا تھا۔ لیکن اس میں کوئی نام شامل نہیں تھا۔ اس بات کی گنجائش بہر حال موجود تھی کہ پولیس تفتیش کے بعد کسی کو بھی شامل کر سکتی تھی۔

"تم دو تین روز یہیں رہو جیدے بیگ صاحب کے پاس۔ ابھی تمہارا کالج جانا ٹھیک نہیں۔" عارف نے مجھے نصیحت کی۔

"ہاں! ہاں! بھئی ہم اپنے بندے کو ایسے تو جانے نہیں دیں گے ناں۔" بیگ صاحب نے معنی خیز ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"جیسی آپ کی مرضی جناب۔" میں نے ہونقوں کی طرح گردن ہلا دی۔

دونوں دوسرے کمرے میں تھوڑی دیر کے لئے اٹھ کر گئے اور آپس میں کچھ پرائیویٹ سی گفتگو کرتے رہے۔ شاید اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ یہ خچر کس حد تک کام آسکتا ہے۔ پھر بیگ تو واپس آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ ملک عارف نے مجھے اشارے سے بلایا اور دوسرے کمرے میں لے جا کر سو سو کے کئی نوٹ میرے ہاتھوں میں تھما دیئے۔

"پانچ ہزار روپے ہیں جیدے خاں! تمہارا انعام۔ بس اب سمجھو تمہاری قسمت کھل گئی۔ عالیہ تمہاری مٹھی میں آگئی۔" اس نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ بیگ صاحب کا خیال رکھنا بڑے کام کے آدمی ہیں ایسے آدمی کو ہاتھ سے نکلنے نہ دینا۔ میری بات سمجھ گئے ناں۔" اس نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

مجھے اس کی بات تو کیا خاک پلے پڑتی بس یوں ہی سر ہلا دیا۔ "ہاں ملک جی! بے فکر رہو۔ تمہیں شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا۔"

"اچھا خدا حافظ۔" کہہ کر ملک عارف چلا گیا۔

میں بیگ صاحب کے پاس واپس آ گیا۔ جیبوں میں پانچ ہزار روپے کے نوٹ ڈالتے ہوئے میں خود کو آسمان پر تیرتا محسوس کر رہا تھا۔ اب عالیہ کو مجھ سے کون الگ کر سکتا تھا۔ یہی تھی وہ واحد سوچ جو میرے دل میں جاگزیں تھی۔ مجھے اپنے تعلیمی کیریئر کی، اپنے والدین کی، اپنے بہنوئی کی بالکل فکر نہ تھی۔ میرے دل میں شیطان نے یہ خیال بھی نہ آنے دیا کہ میں ایک نوجوان کو گولی مار کر آیا ہوں جو میری طرح کسی کے آنگن کا واحد دیا بھی ہو سکتا ہے۔ کسی ماں کے مستقبل کی اکیلی امید بھی ہو سکتا تھا۔ اگر

وہ مر گیا تو؟ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

"آؤ بھئی تمہیں تمہارا کمرہ دکھا دیں۔ تم آرام کرو۔ مجھے ایک میٹنگ میں جانا ہے۔" بیگ نے مجھے ایک کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

کمرہ کسی رئیس کی خوابگاہ دکھائی دیتا تھا۔ جس کے ایک کونے میں وی سی آر اور ٹی وی نصب تھا اور آرام دہ بیڈ کے کنارے ایک چھوٹا فریج دھرا تھا۔

"تم ذرا آرام کرو۔ رات کا کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ مجھے ایک سیاسی میٹنگ میں جانا ہے۔" بیگ نے مجھے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

آج تک میں نے کرائے کی فلمیں لا کر ہی کبھی کسی دوست کے گھر وی سی آر دیکھا تھا۔ آج سب کچھ میرے سامنے تھا۔ شاید بیگ نے یہ سارا جال مجھے پھانسنے کے لئے بچھا رکھا تھا۔ اس کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے ندیدے بچوں کی طرح وی سی آر کے نزدیک رکھی فلموں میں سے ایک فلم نکال کر چلا دی۔ کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

"اف میرے خدایا۔"

جیسے جیسے فلم چل رہی تھی میرے اعصاب تن رہے تھے۔ یہ بلیو فلم تھی۔ ایسی ایک فلم کی جھلک میں نے ایک مرتبہ دیکھی تھی۔ اور اکثر ملک عارف سے تقاضا کیا تھا کہ مجھے ایسی فلم دکھائے۔ ملک عارف نے وعدہ تو کیا لیکن اتفاق سے حالات ایسے نہ بنے۔ آج دو گھنٹے کی مسلسل فلم میرے سامنے چل رہی تھی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر فلم میں غرق تھا۔ کسی نے میرے کمرے کی طرف آنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ شاید یہ اس کوٹھی کی انکسی تھی۔ میں نے اس دوران فریج میں سے دو بوتلیں نکال کر پی لی تھیں۔ لیکن ایک آگ سی مسلسل میرے اندر دھکنے لگی تھی۔ فلم ابھی چل ہی رہی تھی جب اچانک دروازہ کھلا میں تو گھبرا ہی گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرے سامنے بیگ صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ مجھے دو ڈھائی گھنٹے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔

"کیسا مال ہے؟" انہوں نے لفنگوں کی طرح آنکھ دبا کر پوچھا۔

"میں نے دانت نکال دیئے۔

مجھے جلد ہی احساس ہو گیا کہ بیگ اور عارف میں کوئی فرق نہیں۔ یہ شخص یوں تو ملک کی مقتدر سیاسی شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا لیکن ذہنی طور پر جنسی اور نفسیاتی مریض تھا۔ اس نے میرے کمرے میں ہی ملازم سے شراب منگوالی اور میرے ناں ناں کرنے کے باوجود ایک دو پیگ مجھے بھی پلا دیئے۔ پھر ہم دونوں نے کھانا کھایا اور اسی کمرے میں آ گئے۔ اب میرا دماغ واقعی گھومنے لگا تھا۔ میری رگوں میں خون کے بجائے انگارے دوڑ رہے تھے۔ اچانک میں نے عجیب سی حرکت محسوس کی بیگ میرے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے بڑی گھٹیا فرمائش کر دی۔ وہ مجھ سے ایسی ہی حرکت کا تقاضا کر رہا تھا جو ملک عارف اپنے کمرے میں کیا کرتا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ بس ذہن میں ایک ہی بات سا گئی تھی کہ میں ایک مفرور ملزم ہوں جو اس درندے کی پناہ میں ہے اور ملک عارف کا وہ معنی خیز فقرہ کہ بیگ صاحب کو ناراض نہ کرنا۔ اس نے مجھے کہا تھا۔

"جیدے یہ بڑے خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ اگر ناراض ہو جائیں تو زندگی کو جہنم بنانے کی سکت رکھتے ہیں۔ خوش رہو تو پو بارہ۔"

بیگ نے میری جسمانی ساخت کو اپنے گھناؤنے عزائم کی بھینٹ چڑھا دیا۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا جب سو کر اٹھا تو بیگ غائب تھا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہاں ایک مؤدب ملازم موجود تھا۔ اس نے مجھے ایک پرچی تھما دی جس پر ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا اور وہاں فون کرنے کو کہا۔ میں نے فون کیا دوسری طرف ملک عارف تھا۔ اس نے میرا حال چال دریافت کیا۔

"ملک صاحب آپ نے مجھے کس عذاب میں ڈال دیا۔ میں اس لائن کا بندہ

نہیں۔"میں نے ہلکا سا احتجاج کیا۔

"جیدے خاں! بیوقوف مت بنو۔ وہ لڑکا جسے تمہاری گولی لگی تھی زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ تمہیں ایک دو لڑکوں نے اسے گولی مارتے دیکھ لیا تھا۔ اگر پولیس سے بچ گئے تو مخالف تنظیم والے مار ڈالیں گے۔ ہمیں اس مصیبت سے صرف بیگ ہی بچا سکتا ہے۔ اگر تم نے اس کی بات نہ مانی تو میں بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یار کیوں مرے جا رہے ہو۔ ایک آدھ دن کی تو بات ہے۔ پھر تم ہو گے اور عالیہ ہو گی۔"

اب مجھے حقیقت حال کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ میں بری طرح پھنس چکا ہوں اور مجھے اس حرامی کی جائز ناجائز خواہش پوری کرنی پڑے گی، وہ منحوس تھوڑی دیر بعد سلیپنگ سوٹ پہنے وہاں آ گیا۔ اس کے چہرے پر رات والے واقعات کا نام و نشان کسی معمولی تاثر کی شکل میں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے مجھے احساس ہی نہ ہونے دیا کہ رات وہ کیا گھناؤنا فعل انجام دے چکا ہے۔ میں نے کمرے سے ملحقہ باتھ روم میں نہا دھو کر اس کے فراہم کردہ کپڑے تبدیل کئے اور ناشتہ کرنے لگا۔ بیگ تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس نے اپنے نوکر کو میرا ہر طرح خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اس کی روانگی کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ملک عارف آ گیا۔ یہ وقت میں نے اخبارات پڑھ پڑھ کر گزارا تھا۔ تمام اخبارات کل کے واقعات سے بھرے تھے۔ واقعی مضروب کی حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں ہوئی تھی۔ اگلے ہفتے میرے ایف اے کے امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ میں اس صورت حال سے گڑبڑا کر رہ گیا۔

"گھبرانے والی کوئی بات نہیں جیدے۔" ملک عارف نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھے مخاطب کیا۔ "تم سمجھو کہ امتحانوں میں تم فسٹ ڈویژن حاصل کر چکے ہو۔ تم جانتے نہیں جیدے بیگ صاحب کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ ان سے ملاقات کو تو لوگ

ترستے ہیں۔ اگر انہوں نے تمہیں "دوستی" کے لئے چن لیا ہے تو تمہاری خوش قسمتی ہے۔" اس نے بڑی مکاری سے حالات کی ایسی تصویر میرے سامنے پیش کی کہ میرے لئے سوائے "ہوں ہاں" کے اور کوئی چارہ ہی باقی نہ رہا۔

شام تک ملک عارف میرے پاس رہا۔ یہ وقت ہم نے بیہودہ فلمیں دیکھ کر اور ٹیلی فون کر کے گزارا۔ دوپہر کو پر تکلف کھانا ہمارے لئے آ گیا تھا۔ شام کے بعد وہ شیطان بھی لوٹ آیا۔ اس نے آتے ہی مجھ پر احسان جتا دیا کہ بڑی مشکل سے ان لوگوں نے مجھے پرچے میں سے نکالا ہے۔ اب میں بظاہر تو محفوظ ہوں۔ لیکن مجھے محتاط رہنا پڑے گا۔ رات ہونے سے پہلے عارف چلا گیا۔ اس خبیث نے پھر وہی شیطانی عمل دہرانے کے لئے مجھے مجبور کیا اگلے روز صبح کو عارف مجھے اپنے ساتھ ہوسٹل لے آیا۔

ہوسٹل میں یونین والوں نے میرا استقبال ایسے کیا جیسے کسی سربراہ مملکت کا کیا جاتا ہے۔ طاہر اور دو تین دوسرے لڑکے میرے کمرے میں میرے منتظر تھے۔ میں بالکل نہ سمجھ سکا کہ اس سارے ڈرامے کے پس پردہ ملک عارف کی شاطر شخصیت کار فرما ہے۔ وہ میرے غبارے میں اتنی ہوا بھر دینا چاہتا تھا کہ پھر جب چاہے سوئی کی نوک سے مجھے دھماکے کی طرح اڑا کر رکھ دے۔

اسی روز رات کو ہم عالیہ کا گانا سننے گئے۔ میں نے جس طرح حرام کی دولت ملی تھی اسی طرح عالیہ پر لٹا دی۔ مجرے کے خاتمے پر عالیہ نے بڑے ناز و ادا سے میرا شکریہ ادا کیا۔ اس نے بازار سے میرے لئے کھانا منگوا کر خاص طور سے میرے ساتھ کھانا کھایا اور یہ اصرار کرتی رہی کہ میں روزانہ اس سے ملنے آیا کروں مجھے گدھے کو اس نے احساس دلایا کہ جیسے وہ مجھ پر مرمٹی ہے، لیکن ابھی زبان سے باقاعدہ اقرار نہیں کرنا چاہتی۔ دوسری طرف میں بیوقوف سوچ رہا تھا کہ کب تک بچے گی آخر ایک روز اسے میری محبت کے سامنے جھکنا ہی پڑے گا۔

الیف اے کے امتحانات شروع ہوگئے۔ طاہر اور اس کے ساتھیوں نے میرے لئے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ میٹرک کے امتحان کی طرح اس مرتبہ بھی سپرنٹنڈنٹ نے میری طرف سے آنکھیں بند رکھیں اور میں اطمینان سے اپنے پرچے حل کرتا رہا۔ امتحان ختم ہوئے تو پولیس نے ہوسٹل خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ کیونکہ ہنگامہ آرائی پھر شروع ہوگئی تھی۔ جس روز پولیس نے رات کو چھاپا مارا میری خوش قسمتی کہ طاہر والا ریوالور ملک عارف کے پاس تھا جو اس نے اپنی موٹر سائیکل کے ٹول بکس میں چھپا رکھا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ہم بچ گئے۔

ہمیں پولیس کی طرف سے اگلے روز ہوسٹل خالی کر دینے کو کہا گیا تھا۔ میں امتحانات سے فارغ ہو چکا تھا۔ لیکن میرا دل گاؤں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ شہر کا ایسا چسکا لگ گیا تھا کہ میں نے والدین کو یکسر فراموش کر دیا جو بے چارے نجانے دل میں کتنی آرزوئیں جگائے میرے منتظر تھے۔

میرے پاس اس دوران جوئے کے جمع ہونے والے پانچ چھ سو روپے موجود تھ ملک عارف نے مجھے کہا کہ پانچ چھ روز اپنے گھر گزار لو۔ پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔ میں نے عالیہ سے ملنے کی ضد کی۔ تو اس نے کہا۔

”جیدے بیوقوف مت بنو۔ اگر تم وہاں خالی ہاتھ گئے تو مچھلی تمہارے ہاتھوں سے پھسل جائے گی۔“

”لیکن پیسے کہاں سے آئیں گے۔“ میں نے بیقراری سے پوچھا۔

”اس کی تم فکر نہ کرو۔ ذرا صبر کرو۔“ اس نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

بادل نخواستہ میں گھر چلا آیا۔ جہاں والد کی نصیحتیں میرے استقبال کو موجود تھیں۔ وہ اس بات پر ناراض تھے کہ میں نے کبھی بہن کے گھر جانے کا تکلف نہیں کیا۔ حالانکہ

میرا بہنوئی ہسپتال میں داخل رہا۔ اس بے چارے کو اچانک گردوں کی تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ یہاں آکر مجھے علم ہوا کہ میری بڑی بہن نے گھر پر ٹیوشن سنٹر کھول لیا تھا کیونکہ اس کے خاوند کی بیماری طویل ہوتی جا رہی تھی اور اب وہ نوکری سے بھی اس نامراد بیماری کے ہاتھوں ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ بہن کے ساتھ بوڑھی ساس تھی یا پھر ایک دیور اور دیورانی، بے چاری کو ان تینوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑا۔ اس کا دیور بھی میری ہی قبیل کا تھا جو کماتا اڑا دیتا۔ خدا جانے میرے ضمیر کو ملک عارف نے کون سی گولی کھلا کر اتنی گہری نیند سلا دیا کہ وہ اب بیدار ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن کا ذرا خیال نہ آیا۔ بس میرے دل و دماغ پر تو صرف عالیہ کا قبضہ تھا۔

پانچ سات روز میں نے گاؤں میں جیسے تیسے گزارے پھر لاہور میں اپنے بہنوئی کی تیمارداری کا بہانہ کر کے لاہور آگیا۔ پہلے میں نے بہن کے گھر گیا۔ بے چاری میرے گلے لگ کر بچوں کی طرح رونے لگی۔ اس کے دو چھوٹے بچے حیرت سے اپنے ماموں کی شکل دیکھ کر اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہنوئی کی تیمارداری کر کے میں نے اپنی دانست میں گویا والدین کا قرض اتار دیا۔

اگلے ہی روز بہن کے اصرار کے باوجود میں ملک عارف کے گاؤں کی طرف عازم سفر تھا۔ اس کا گاؤں لاہور سے ساٹھ ستر میل دور تھا۔ ملک عارف نے مجھے دیکھا تو اسکی باچھیں کھل گئیں۔

”واہ بھئی واہ یار ہوں تو ایسے۔“ اس نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

وہ اس علاقے کے بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ میں تو یہاں اس کی شان و شوکت دیکھ کر حیران ہی رہ گیا۔ ملک عارف مجھے اپنی زمینوں پر حویلی میں لے آیا۔ یہ حویلی بالکل الگ تھلگ تھی اور میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے صرف عیاشی کے لئے ہی بنائی ہوئی تھی۔ حویلی کے ایک بڑے کمرے کو جدید شہری سہولتوں سے مزین کیا گیا تھا۔ اس کا

ایک خاص مزارع ہمارے لئے جانے کہاں سے موج میلے کا سامان لے آیا تھا۔ یہ کوئی پیشہ ور لڑکی تھی جو رات کی تاریکی میں شراب کی بوتل سمیت اس حویلی میں پہنچائی گئی۔ ملک عارف نے مجھ پر احسان جتلاتے ہوئے کہا کہ یہ خصوصی اہتمام اس نے میرے لئے کیا ہے کیونکہ میں پہلی مرتبہ اس کے گھر مہمان آیا ہوں۔ یہاں پھر اس نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبا کر کہا۔

"جیدے خاں! ہم یاروں کے یار ہیں۔ تم مرد بندے ہو۔ ہم مردوں کی قدر کرنا جانتے ہیں۔"

ساری رات ہم دونوں اس لڑکی کی بوٹیاں کتوں کی طرح نوچتے رہے۔ علی الصباح ملک عارف کا خصوصی مزارع اس کی جیپ پر لڑکی کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ہم لاہور آ گئے۔

لاہور ہم سیدھے طاہر کے گھر آئے تھے۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے ایک خطرناک پروگرام بنایا۔ کیونکہ بیگ ان دنوں ملک سے باہر گیا ہوا تھا اور مجھے عالیہ کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے میں نے اس پر صاد کر دیا۔ اس پروگرام میں طاہر اور اس کا ایک اور ساتھی بھی ہمارے ساتھ شامل تھے۔ ہم چاروں دو موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر شہر کے ماڈرن علاقے کے ایک پٹرول پمپ پر گئے۔ طاہر ہمیں موقعہ دکھانے لایا تھا۔ پھر ہم واپس آ گئے۔ اور یہاں بیٹھ کر پٹرول پمپ کو لوٹنے کا پروگرام بنانے لگے۔ سارا پلان طاہر نے تیار کیا تھا۔ لیکن اس میں قربانی کا بکرا مجھے بنایا گیا۔ طے یہ پایا کہ وہ دونوں موٹر سائیکلوں پر بیٹھے رہیں گے میں اور طاہر کا ساتھی پستول کی زور پر رقم چھین کر لائیں گے۔ وہ ہمیں بھگا لے جائیں گے۔ ہنگامی حالت میں ہم چاروں کے پاس بھرے ہوئے ریوالور موجود تھے۔ واردات کے لئے رات دس بجے کا وقت طے پایا۔ طاہر کی اطلاع کے مطابق رات دس بجے کے بعد اس پٹرول پمپ کا مالک کیش گھر لے جا کر صبح بینک

میں جمع کروا دیا کرتا تھا۔

پلان کے مطابق ہم پٹرول پمپ پر پہنچے۔ دونوں نے موٹر سائیکل قدرے اندھیرے میں کھڑے کر لئے۔ دور دور تک کسی ذی ہوش کا نام و نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہم دونوں قربانی کے بکروں نے اپنی جیبوں میں موجود نقاب منہ پر اوڑھے اور پٹرول پمٹ کے کھرے میں جا گھسے۔ جہاں ایک محنتی سا شخص بیٹھا کیش گن رہا تھا۔ اس نے اپنے طرف دو ریوالوروں کو لہراتے دیکھا تو اس کی گھگی بندھ گئی۔ بغیر کسی مزاحمت کے ہم نے سارے کرنسی نوٹ اپنے پاس موجود تھیلے میں منتقل کر لئے اور اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے ہمارے جانے کے بعد شور مچایا تو ہم اسے پٹرول پمپ سمیت دھماکے سے اڑا دیں گے۔ اس کے دو ملازم اندر موجود صورت حال سے بالکل بے خبر باہر سردی میں ٹھٹھر رہے تھے۔

جانے سے پہلے میں نے طاہر کے سمجھانے کے مطابق ٹیلیفون کے تار جھٹکے سے توڑ دیئے۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے باہر آئے۔ ہمیں باہر آتے دیکھ کر دونوں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر لئے۔ نوٹوں والا تھیلا میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ملک عارف کے پیچھے جا بیٹھا۔ ہمیں اس طرح بھاگتے دیکھ کر ملازموں کو شک گزرا اور انہوں نے شور مچا دیا۔ لیکن اب ہم ان کی دسترس سے باہر تھے۔ طاہر کے تعاقب میں ہم نے اس ماڈرن آبادی کی مختلف گلیوں میں اس طرح موٹر سائیکلیں گھمائیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی پندرہ بیس منٹ بعد ہم دوبارہ طاہر کے گھر پہنچ چکے تھے۔

"ویل ڈن" طاہر نے کمرے میں پہنچتے ہی مجھے شاباش دی۔

انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کے لئے سروں پر ہیلمٹ ڈال رکھے تھے۔ سب کے سامنے ملک عارف نے پیسے گنے۔ ہماری توقعات سے بڑھ کر یہ ساٹھ ہزار سے زیادہ کی رقم تھی۔ رقم ہم نے آپس میں تقسیم کر لی۔ مجھے انہوں نے پانچ ہزار زیادہ

دیئے تھے۔

میں اڑ کر عالیہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے صبر کی تلقین کی۔ وہ رات ہم نے اسی کمرے میں گزار دی اور اگلی صبح وہاں سے نکل گئے۔ اس مرتبہ ہم ملک عارف کے ایک دوست کے گھر پہنچے۔ جہاں ہم نے کپڑے وغیرہ تبدیل کئے اور ناشتہ کر کے عالیہ کے ڈیرے پر چل دیئے۔

عالیہ نے مجھے اور ملک عارف کو دیکھا تو خدا جانے ملک نے اسے کیا اشارہ کیا کہ وہ بھاگ کر مجھ سے لپٹ گئی اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ روہانسے لہجے میں بولی آپ نے اتنے دن کہاں لگائے؟"

میں نے سمجھ لیا کہ بس اب اس پر میری محبت کا جادو چل گیا ہے۔ ملک عارف ہمیں کسی بہانے اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ عالیہ نے مجھ اپنے ہاتھوں سے پان کھلایا۔ پھر میری جدائی کا رونا رونے لگی۔ ملک عارف کی واپسی چند منٹ بعد عالیہ کی نائکہ ماں کے ساتھ ہوئی۔ عالیہ چائے لانے کے بہانے اٹھ کر چلی گئی۔ ملک عارف نے اس نائکہ سے میرا تعارف ایک امیر زادے کی حیثیت سے کروایا۔ نائکہ اپنی تربیت کے مطابق مجھ پر صدقے واری ہونے لگی۔ ملک عارف نے اسے ایک ہزار روپے میری طرف سے "سلام" کا دیا۔ وہ مجھے ساری سکیم سمجھا کر لایا تھا کہ ہمیں یہاں کرنا ہے۔ معاملہ اس نے نائکہ سے طے کر لیا تھا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے عالیہ کی گود میں دس ہزار روپے ڈال دیئے۔ دونوں ماں بیٹی کی باچھیں کھل گئیں۔ نائکہ نے صدقے واری کرتے روپے سنبھالے اور باہر چلی گئی۔

"تم آج اپنی عالیہ کے ناز نخرے اٹھاؤ میں کل آؤں گا۔" کہہ کر ملک عارف بھی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ شام ڈھلے تک نائکہ نے کبھی سگریٹ، کبھی پان، کبھی کھانا اور کبھی چائے کے بہانے مجھ سے ہزار بارہ سو روپے اور ہتھیا لئے۔ پھر ہم دونوں کو اکیلا

چھوڑ کر چلی گئی۔

اس رات عالیہ نے مجرہ نہیں کیا۔ ساری رات وہ میری ناز برداری کرتی رہی اس نے مجھے جسمانی لذت کے ان ان جہانوں کی سیر کروائی جو کبھی میرے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ جسم فروشی کا پیشہ نہیں کرتے۔ لیکن چونکہ پہلے ہی دن اس نے مجھے اپنے خاوند کی حیثیت سے قبول کیا تھا اس لئے وہ اس کام کو تیار ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

"جاوید صاحب! خدا کے لئے جتنی جلدی ممکن ہو مجھے اس دنیا سے نکال کر لے جایئے۔"

"اس کی کیا صورت ہو گی۔" میں نے پوچھا۔

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے جاوید صاحب کہ میری ماں کا منہ سونے کے نوالوں سے بھر دیجئے۔ وہ جب تک میری مکمل قیمت وصول نہیں کرے گی مجھے اس گناہ کی دلدل سے نکلنے نہیں دے گی۔" اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

"میں نے کہا" عالیہ تم مطمئن رہو۔ میں تمہیں حاصل کرنے کے لئے جان کی بازی لگا دوں گا۔"

عالیہ مطمئن ہو گئی۔ اس مکار طوائف نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس نے مجھے اچھی طرح شیشے میں اتار لیا ہے اور اب میں بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔

صبح میں رکشے میں بیٹھ کر ملک عارف کے ٹھکانے پر آ گیا۔ اب میرا خوف اتر چکا تھا۔ مجھے کسی بات کی پرواہ نہیں تھی۔ بس مجھے دولت چاہئے تھی۔ ملک عارف نے مجھے کہا کہ انہوں نے ایک اور پروگرام بنایا ہے۔ اس مرتبہ ذرا لمبا ہاتھ مارنے کا ارادہ ہے۔

"کیا؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"اس مرتبہ خزانہ لوٹنا ہے۔ ایک آدمی پندرہ بیس لاکھ روپے لے کر بینک سے باہر

نکلے گا۔ ہم نے اس سے پیسے چھیننے ہیں۔" ملک عارف نے بتایا۔

"دن میں؟"

"ہاں!" اس نے کہا۔ "کیونکہ رات کو بنک بند ہو جاتے ہیں۔"

ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔ اس بات کا اندازہ مجھے ہو چلا تھا کہ عارف اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ یہ لوگ اپنے گروہ میں تبدیلیاں کرتے رہتے تھے۔

اس مرتبہ ہمارا کام ذرا زیادہ ہی سخت تھا۔ اس میں میرے علاوہ طاہر اور دو اور لڑکے شامل تھے گویا ایک طرح سے ہم پانچ آدمی مل کر یہ کام کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لئے ایک کار اور ایک موٹر سائیکل استعمال کرنی تھی۔ منصوبہ کچھ اس طرح تھا کہ کار میں موجود تین لڑکوں میں سے دو پستول لے کر ہماری مدد کے لئے باہر کھڑے رہیں گے۔ ڈرائیور گاڑی سٹارٹ رکھے گا۔ موٹر سائیکل پر ملک عارف اور میں بیٹھیں گے۔ مجھے آگے بڑھ کر رقم والا بیگ چھیننا تھا۔ مداخلت کی صورت میں پستول میرے پاس بھی موجود تھا اور ممکنہ مقابلے کی صورت میں دونوں مسلح لڑکے میرے مددگار ہوتے۔ تھیلا ہم نے کار میں پھینک دینا تھا۔ وہ لوگ الگ راستے سے فرار ہوتے اور میں ملک عارف کے ساتھ دوسرے راستے سے۔ ہم نے فرار ہو کر کہاں جانا تھا۔ اس کا علم طاہر یا ملک کے علاوہ اور کسی کو نہیں تھا۔

ہم نے اسی اثنا میں خاصی مشق بھی کر لی تھی۔ واردات والے دن منصوبے کے مطابق ہم نے کام شروع کیا۔ خاصا پر رونق علاقہ تھا۔ لیکن ان لوگوں نے منصوبہ تیار کرتے ہوئے اس بات کو ذہن میں رکھا ہو گا۔ وہ شخص کیش لے کر بنک سے اپنی کار کی طرف چلا جو بنک کے دروازے کے سامنے ہی پارک کی گئی تھی جیسے ہی وہ بنک سے برآمد ہوا ملک عارف نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے کام شروع کرنے کو کہا، میں نے منہ پر نقاب لگایا اور اس کی طرف پستول تان کر اسے بیگ دینے کو کہا۔

آدمی کوئی اتنا بہادر نہیں تھا، لیکن مضبوط قوت ارادی کا مالک نظر آتا تھا اس نے اپنی گرفت بیگ پر مضبوط کر لی اور بنک کی طرف واپس بھاگنا چاہا اس کا خیال تھا کہ اس طرح وہ چوکیدار کی مدد حاصل کر سکے گا۔

"جیدے جانے نہ دینا۔" ملک عارف نے مجھے للکارا۔

میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے گولی داغ دی جو خوش قسمتی سے اس کی کمر میں لگی اور وہ گر پڑا۔ اس اثناء میں میرے ہمراہیوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ میں نے بیگ اٹھایا اور کار میں پھینک دیا۔ خود پھرتی سے ملک عارف کے پیچھے جا بیٹھا۔ اس دوران ملک عارف نے بھی دو فائر کر دیئے تھے۔ لوگ خوفزدہ چوہوں کی طرح ادھر ادھر چھپتے پھر رہے تھے۔ حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ بنک کا چوکیدار بھی سہم کر اندر ہی بیٹھا رہا۔ حالانکہ اگر کوئی ہمت کرتا تو ہم شاید کامیاب نہ ہوتے۔

ملک عارف کے سفر کا اختتام بیگ صاحب کی کوٹھی پر ہوا۔ کار والے ساتھی وہاں پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ میں نے حیرانگی سے ملک عارف کی طرف دیکھا۔

"جیدے خاں" ہم اس آدمی کے بغیر زیرو ہیں۔ اس کو ہر کام میں حصہ دینا پڑتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے ہاتھوں دوسرے آدمی کو گولی لگی ہے اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھنا۔" اس نے مجھے باتوں باتوں میں سب کچھ سمجھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہم بیگ کے سامنے موجود تھے۔ اس نے ہمیں فی کس 25 ہزار روپیہ دیا اور ہم چپ چاپ وہاں سے چلے آئے۔ کسی نے معمولی سا احتجاج بھی نہیں کیا، بیگ میرے ساتھ اسی طرح پیش آ رہا تھا۔ جیسے مجھے پہلی مرتبہ ملا ہو۔ میں نے بھی اس بات پر توجہ نہ دی۔ میں ملک عارف کے ساتھ اس کے گاؤں چلا آیا۔ لیکن اس بات پر کڑھتا رہا کہ ساری رقم وہ کم بخت خود ہضم کر گیا اور ہم جو اپنی جان پر کھیل گئے تھے۔ ہمیں اس نے گھاس تک نہیں ڈالی۔ جب میں نے عالیہ کی طرف جانے کو کہا تو ملک

عارف نے فی الوقت جانے سے منع کر دیا۔

"جیدے خاں ذرا دماغ کو بھی استعمال کرنا سیکھ لو۔ شہر میں اتنی بڑی واردات ہوئی ہے پولیس شکاری کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔ اس بازار پر پولیس کی خاص نظر ہوتی ہے۔ کیونکہ پولیس والے جانتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ ادھر کا ہی رخ کریں گے۔ ہر ڈیرے پر پولیس کے مخبر موجود ہوتے ہیں اور تم...... یار تم کہیں ہم سب کو مروا نہ دینا۔" اس نے اکھڑے اکھڑے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب جیسا آپ بہتر سمجھیں۔" میں خاموش رہا۔

ملک عارف کے ہاں میں نے پانچ چھ روز خوب عیاشی کی پھر اپنے گاؤں چلا آیا۔ جہاں دس پندرہ دن تک میں نے کسی کو رقم کی کانوں کان ہوا نہ لگنے دی۔ اس روز میرے ایف اے کے نتیجے کا اعلان ہوا تھا۔ میری اس مرتبہ بھی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی، بہر حال میری ماں خوش تھی کہ میں نے ایف اے پاس کر لیا۔ والد بضد تھے کہ میں سی ٹی وغیرہ کر لوں۔ لیکن میں نے "اعلیٰ تعلیم" کی ضد شروع کر دی۔

اگلے روز یہ منحوس خبر ملی کہ میرا بہنوئی فوت ہو گیا ہے۔ ہم سب لاہور چلے آئے۔ یہ بہت بڑا حادثہ تھا۔ لیکن میرے جیسے بے غیرت اور بے ضمیر انسان نے اسے محسوس نہ کیا۔ والدین سات آٹھ روز بعد واپس چلے گئے اور میں سیدھا عالیہ کے ڈیرے پر۔

جب میں نے اس کے سامنے 20 ہزار کی رقم رکھی تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں اس کی نائکہ ماں نے میرا ماتھا اور سر درجنوں مرتبہ چوما۔ رقم اپنے قبضہ میں کی اور بیٹی مجھے سونپ دی۔ یہاں چار پانچ روز میں موج میلہ کرتا رہا۔ اس دوران عالیہ نے مجھے سرور لذت کے بہت سے جہانوں سے آشنائی بہم پہنچا دی تھی جب جیب خالی ہونے لگی تو واپس چلا آیا۔

میں نے بی۔ اے میں بھی اسی کالج میں داخلہ لیا تھا ملک عارف ایم اے کا طالب علم بن چکا تھا۔ ہمارا حوصلہ اب کچھ زیادہ ہی کھل گیا۔ ہم نے مل کر دو تین پٹرول پمپ لوٹے۔ عالیہ نے مجھے چسکا لگا دیا تھا اس کے لئے میں کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔ اس دوران میں نے بیگ کے کہنے پر دو تین سیاسی جلسوں میں بھی "خدمات" انجام دیں۔ میں ملک عارف کو اکثر کہا کرتا تھا کہ یہ کم بخت ہم سے حصہ کیوں لیتا ہے؟ ایک روز ہم نے الگ سے پروگرام بنا لیا۔ اس منصوبے میں ملک عارف اور اس کا ایک بدمعاش تایہ ہمارے ساتھ شامل تھا۔ ہم نے اس مرتبہ ایک کوچ کو لوٹنے کا پروگرام بنایا تھا۔ منصوبے کے مطابق ہم کوچ کے مسافروں میں شامل ہو گئے۔ اور لاہور سے باہر نکلنے پر ایک ویران جگہ اٹھ کر میں نے ڈرائیور کی کنپٹی پر پستول لگا دیا۔ جبکہ دوسرے لوگوں نے رائفلیں تان کر مسافروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم اپنے کام سے فارغ ہو چکے تھے۔ ہم نے مسافروں کو وہیں اتار دیا اور کوچ میں فرار ہونے لگے۔ بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ پولیس کی ایک گشتی جیپ اچانک ادھر آ نکلی۔ مسافروں نے دہائی مچائی تو وہ لوگ ہمارے تعاقب میں آ گئے۔ انہوں نے وائرلیس پر آگے بھی اطلاع کر دی تھی۔

میں ابھی اتنا سورما نہیں بنا تھا کہ پولیس سے مقابلہ شروع کر دیتا۔ نہ ہی میرے ساتھیوں میں کوئی اس قابل تھا۔ ہم نے جلد ہی ہتھیار ڈال دیئے۔ پولیس نے الگ الگ ہماری تفتیش شروع کی۔ میرے کبھی بڑوں نے بھی تھانہ نہیں دیکھا تھا۔ میں تو دو چار جوتے کھا کر ہی "چالو" ہو گیا۔

تھانے میں پہلے ہی روز جب صبح ہماری تصویریں اخبارات میں چھپیں تو ایک شخص ہماری ملاقات کو آ گیا۔ وہ سیدھا مجھے آ کر ملا اور کہا کہ مجھے عالیہ نے بھیجا ہے۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ عالیہ نے پیغام بھیجا تھا کہ میں بے فکر رہوں۔ وہ میری ہر طرح مدد

کرے گی۔ اس شخص نے مجھے کہا اگر مرد کے بچے ہو تو اپنی محبوبہ کو تھانے نہ بلانا۔ میری سوئی غیرت عالیہ نے جگادی۔ حالانکہ یہ بھی ان لوگوں کی چال تھی۔

اس دوران پولیس نے تاڑ لیا تھا کہ میں کمزور آدمی ہوں۔ انہوں نے مجھے سلطانی گواہ بننے کا لالچ دیا اور میں لالچ میں آگیا۔ میں نے بلا کم و کاست سارے واقعات بیان کر دیئے۔ بس عالیہ اور بیگ کا نام نہیں لیا۔ کیونکہ بیگ کی طاقت کا مجھے اندازہ تھا۔

ہمیں جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ والدین کو علم ہوا تو گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ گرفتاری کے بعد احساس ہوا کہ میں نے کس جہنم کی آگ کا خود کو ایندھن بنا لیا تھا۔ مقدمہ چلا اور تین ماہ بعد ہی ایک خصوصی عدالت نے مجھے دس سال قید کا حکم سنا دیا۔ میرے ساتھیوں کو بھی سزائیں دی گئیں۔

مجھے جیل میں دو سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس دوران سوائے بوڑھے والدین اور بیوہ بہن کے اور کوئی مجھے ملنے نہیں آیا۔ ایک خاص آدمی کے ذریعے میں نے عالیہ کو پیغام بھیجا تھا۔ جس نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اس کے ڈیرے والوں نے میرے قاصد کی اتنی بے عزتی کی کہ اب جیل کا کوئی ملازم میری کوئی بات ہی سننے کو تیار نہیں۔ زندگی کا یہ جہنم میں اب تیسرے درجے کے ایک قیدی کی حیثیت سے بھگت رہا ہوں۔